قرآن وسنت اور اسلاف امت کی تعلیمات کا داعی
دینی، علمی، ادبی، تحقیقی اور اصلاحی مضامین کا حامل

مجلّہ صدائے حق بنگلور

سرپرست

حضرت مولانا **محمد سلمان صاحب** بجنوری زیدت معالیہم
استاذ حدیث و مدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

مدیر
عبدالرزاق بنگلوری

نائب مدیر
مفتی عبدالرحمٰن بنگلوری

ناشر
مجلس، صدائے حق اسلامک پورٹل بنگلور-78

قرآن وسنت اوراسلافِ امت کی تعلیمات کا داعی

دینی، علمی، ادبی، تحقیقی اوراصلاحی مضامین کا حامل

مجلّہ

صدائے حق بنگلور

جلد: ۰۳ | شمارہ: ۹ | ماہ اپریل ومئی ۲۰۲۳ء | ماہ رمضان وشوال ۱۴۴۴ھ

سرپرست

حضرت مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری دامت برکاتہم

استاذِ حدیث ومدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

مدیر	نائب مدیر
عبدالرزاق بنگلوری	مفتی عبدالرحمٰن صاحب بنگلوری

مجلس ادارت

مفتی محمد علی صاحب قاسمی

مولانا محمد اُویس صاحب رشادی

مولانا عبداللطیف صاحب قاسمی

مجلسِ مشاورت

مولانا اشرف صاحب قاسمی

مولانا عبدالقدوس صاحب مظاہری

مفتی عبدالفتاح صاحب قاسمی

ADVERTISEMENT TARIFF

Full Page (Title Back Cover)	6000/-
Full Page (Title Inner Cover)	5000/-

Black and White

Full Page (Inside Pages)	2000/-
Half Page (Inside Pages)	1000/-
Cuarter Page (Inside Pages)	500/-

Phone Pe & Google Pay:7406464533

مضمون نگار کی آراسے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں

شائع کردہ

مجلس: صدائے حق اسلامک پورٹل بنگلور 78

فہرست مضامین

عناوین	مضامین	اسمائے محررین	صفحہ نمبر
اداریہ	موجودہ الیکشن اور ہمارا کردار	عبدالرزاق بنگلوری	۳
درسِ حدیث	ناداری کی فضیلت	مفتی عبدالرحمٰن صاحب بنگلوری	۶
اصلاحِ معاشرہ	بین مذہبی شادی کے واقعات اور اُن کا تدارک	مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی	۱۱
,, ,, ,,	تین اہم نصیحتیں	مفتی محمد عفان صاحب منصور پوری	۲۱
,, ,, ,,	حُبِّ رسول ﷺ ضروری ہے	مولوی محمد عبداللہ مہاراشٹری	۲۶
,, ,, ,,	توسل کی شرعی حیثیت	مفتی عبداللطیف صاحب قاسمی	۲۸
,, ,, ,,	قلب کو اخلاقِ محمودہ سے مزین کرنے کا بیان (قسط اوّل)	مفتی محمد سلطان خان صاحب قاسمی	۳۶
احکام ومسائل	رمضانیات پر بعض فضائل کی تحقیق	مفتی احمد اللہ نثار صاحب قاسمی	۴۱
,, ,, ,,	احکام ومسائلِ صدقۂ فطر	مفتی محمد عمران صاحب قاسمی	۶۵

اطلاعِ عام

نوٹ: مضمون نگار اپنے مضامین مندرجہ ذیل ای میل (E-mail) یا واٹسیپ (WhatsApp) پر ان پیج (InPage) فائل روانہ کرسکتے ہیں، جزاکم اللہ خیراً وأحسن الجزاء.

Email: muftiabdurrahman57@gmail.com
Whatsapp No: 09620795460 - 9739349433

ادار یہ

موجودہ الیکشن اور ہمارا کردار

از: عبدالرزاق بنگلوری

ہندوستان میں جمہوری نظام نافذ ہے، اِس کے تحت اِس جمہوری نظام کو چلانے کے لیے کوئی بھی ہندوستانی انتخابی الیکشن لڑسکتا ہے، الیکشن لڑنے والے فرد مسلمان بھی ہوسکتا ہے اور غیر مسلم بھی، ایسے موقعہ پر تمام اُمیدوار اپنی حقانیت کے وعدے کرتے ہیں۔

ووٹ انتہائی قیمتی چیز ہے، ایک جمہوری معاشرے میں یہ ایک طاقت ور ترین غیر متشدد ہتھیار ہے جسے ضرور استعمال کرنا چاہیے، دنیا کے دیگر جمہوری معاشروں کی طرح ہم بھی ہر پانچ سال بعد اس مشق سے گزرتے ہیں، باقی دنیا میں الیکشن امن وخوش حالی اور تبدیلی کے تازہ جھونکے لے کر آتے ہیں؛ لیکن ہمارے یہاں ان کا نتیجہ ہمیشہ اس کے برعکس نکلتا رہا، اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ باشعور معاشروں کے عوام اس ہتھیار کو انتہائی سوچ سمجھ کر استعمال کرتے ہیں اور صحیح اور اہل لوگوں کو منتخب کرکے خود چار یا پانچ سال کے لیے آرام کرتے ہیں جب کہ ہم اہلیت کی بجائے مجبوری، لالچ، تعلق یا تعصب کی بنیاد پر ووٹ دے کر نااہل لوگوں کو اپنے اُوپر مسلط کرکے پانچ سال ہائے ہائے کرتے گزارتے ہیں، پھر کبھی بجلی کے لیے جلوس تو کبھی پانی کے لیے، کبھی ہسپتالوں میں ذلیل تو کبھی تھانے کچہری میں، اکثر لیڈران کوڑیوں سے نکل کر کروڑ پتیوں میں شامل ہوچکے ہیں، ان کی دوسری کے بعد اب تیسری نسل گدی نشین ہونے کے لیے میدان میں ہے، پچاس سال سے ان کی نسلیں جائیدادیں بنانے جبکہ ووٹروں کی نسلیں برتن مانجھنے کے لیے ایکسپورٹ ہوتی رہیں اور یہ سلسلہ ابھی تک اسی شدومد سے جاری ہے؛ لیکن اس میں قصور صرف اس کرپٹ حکمران ٹولے کا نہیں؛ بلکہ کچھ ذمہ داریاں عوام پر اور بالخصوص تعلیم یافتہ افراد پر بھی عائد ہوتی ہیں، اگر آپ غلط لوگوں کو منتخب کریں گے تو پھر ان سے درست فیصلوں کی توقع نہیں کی جاسکتی؛ کیونکہ غلط بندہ صحیح فیصلہ کر ہی نہیں سکتا، بار بار ایسا کرنے کا انجام ہر بار ایسا ہی ہوگا، بقول آئن سٹائن ایک ہی کام بار بار کرکے مختلف نتائج کی توقع کرنا حماقت کے سوا کچھ نہیں؛ اِس لیے صرف ووٹ دینا ہی کافی نہیں؛ بلکہ درست، باکردار اور اہل اُمیدوار کو ووٹ دینا ملی واخلاقی ذمہ داری ہے، جو لوگ سالہا سال گھروں میں بیٹھ کر غلط نظام اور کرپشن کو کوستے رہتے ہیں، ان کے لیے یہ بہترین موقع ہے کہ گھروں سے نکلیں اور معاشرے میں پُرامن

اور مثبت تبدیلی کے لیے اپنا کردار ادا کریں، صحیح اُمیدواروں کا ساتھ دیں اور چوروں اور نوسر بازوں کی مخالفت کر کے انھیں بے نقاب کریں۔

ووٹ نہ صرف آپ کی اور آپ کے اِرد گرد رہنے والے لوگوں کی آواز ہے؛ بلکہ آپ اور آپ کے بچوں کے مستقبل کا تعین بھی اسی سے ہونا ہے، اگر آپ نے ستر سال سے عوام کا لہو چوسنے والوں کا ہی ساتھ دینا ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان یاد رکھیں: ''جس شخص نے کسی ظالم کا ساتھ دیا یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ظلم کر رہا ہے تو وہ اسلام کے دائرے سے نکل گیا''۔ (طبرانی)

ووٹ کی شرعی حیثیت:

مسلمان کے لیے الیکشن میں کھڑا ہونا شرعاً ناجائز نہیں ہے، قوم وملّت کی خدمت کرنے کی ترغیب خود احادیثِ کثیرہ میں آئی ہے؛ البتہ مسلمان لیڈر کو چاہیے کہ وہ الیکشن میں کھڑے ہو کر جائز وناجائز کی پرواہ کیے بغیر عمل نہ کرے، جھوٹ، فریب، دھوکہ اور جھوٹے وعدے سے کلی اجتناب کرے، محض مالی منفعت، دنیاوی لذت؛ نیز جاہ طلبی کے جذبہ سے کھڑا نہ ہو، کسی سے دب کر غیر اسلامی طریقہ کو اختیار نہ کرے، فرقہ پرست عناصر اور بدکردار لوگوں سے گٹھ جوڑ نہ رکھے، اس کا مقصد صرف اور صرف قوم وملّت کی خدمت کرنا، مظلوموں کی امداد کرنا، ناجائز مقدمات میں پھنسے لوگوں کو باعزت بَری کرانا ہو وغیرہ۔ (۲)

(۳) ووٹ کی شرعی حیثیت کم از کم شہادت کی ہے، اِس کو محض سیاسی ہار جیت کا ذریعہ قرار دینا سخت نادانی ہے، قرآن وسنت کی رو سے واضح ہے کہ نااہل، ظالم، فاسق اور غلط آدمی کو ووٹ دینا گناہِ عظیم ہے، اِسی طرح ایک اچھے، نیک اور قابل آدمی کو ووٹ دینا ثواب؛ بلکہ ایک فریضۂ شرعی ہے، قرآنِ کریم میں جیسے جھوٹی شہادت کو حرام قرار دیا ہے اِسی طرح سچی شہادت کو واجب اور لازم فرمایا ہے، ارشادِ باری ہے: ﴿كُونُوا قَوَّامِينَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ﴾ اور دوسری جگہ ہے: ﴿كُونُوا قَوَّامِينَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ﴾ اِن دونوں آیتوں میں مسلمانوں پر فرض کیا کہ سچی شہادت سے جان نہ چُرائیں، اللہ کے لیے ادائیگیٔ شہادت کے لیے کھڑے ہو جائیں، تیسری جگہ سورۂ طلاق میں ارشاد ہے: ﴿وَاَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ﴾ یعنی اللہ کے لیے سچی شہادت قائم کرو، ایک آیت میں ارشاد فرمایا کہ: سچی شہادت کا چھپانا حرام اور گناہ ہے، ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ﴾ یعنی شہادت کو نہ چھپاؤ اور جو چھپائے گا اُس کا دل گنہ گار ہے۔

حاصل یہ ہے کہ مسلمانوں کو ووٹ ضرور ڈالنا چاہیے؛ البتہ ووٹ ڈالنے والا جس اُمیدوار کے حق میں ووٹ ڈال رہا ہے اُس کے حق میں گویا یہ خود ہی گواہی دے رہا ہے کہ یہ اُمیدوار میرے علم کے مطابق سب سے زیادہ

مستحق اور دیانت دار ہے؛ اِس لیے چند اُمور اُس کو ملحوظ رکھنے چاہئیں:

(۱) ووٹ ڈالنے میں احتیاط سے کام لے، غلط جگہ مہر وغیرہ نہ لگے اِس کا خیال رکھے؛ ورنہ اس کا ووٹ ضائع ہوجائے گا جو کہ بڑا نقصان ہے۔

(۲) باہم مشورے سے خوب سوچ سمجھ کر ووٹ دے، محض اپنے تعلقات یا غیر شرعی دباؤ سے متأثر ہو کر ہرگز ووٹ نہ دے۔

(۳) جو اُمیدوار اس کے علم کے مطابق ووٹ کا زیادہ مستحق ہے دیانۃً اُسی کو اپنا ووٹ دے۔

(۴) جس اُمیدوار سے نقصان پہنچنے کا غالب اندیشہ ہو اُس کو ہرگز ووٹ نہ دے۔

(۵) اگر تمام امیدواروں کے حالات یکساں ہوں تو پھر جس سے زیادہ فائدہ کی اُمید اور کم نقصان کا اندیشہ ہو اُس کو ووٹ دے۔

(۶) روپیہ یا کوئی مال لے کر کسی کو ووٹ نہ دے، یہ بدترین رشوت اور حرام فعل ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ ہماری ظالم حکمرانوں سے حفاظت فرمائے، آمین۔

❑❖❑

درسِ حدیث

ناداری کی فضیلت

از قلم: مفتی عبدالرحمٰن صاحب بنگلوری، ناظم مدرسہ دارالتوحید، اعلیٰ ہلی بنگلور

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مُغَفَّلٍ، قَالَ: قَالَ رَجُلٌ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! وَاللّٰهِ! إِنِّيْ لَأُحِبُّكَ! فَقَالَ لَهٗ: ''اُنْظُرْ مَاتَقُوْلُ؟'' قَالَ: وَاللّٰهِ! إِنِّيْ لَأُحِبُّكَ –ثَلَاثَ مَرَّاتٍ– قَالَ: ''إِنْ كُنْتَ تُحِبُّنِيْ فَأَعِدَّ لِلْفَقْرِ تَجْفَافًا، فَإِنَّ الْفَقْرَ أَسْرَعُ إِلٰى مَنْ يُحِبُّنِيْ مِنَ السَّيْلِ إِلٰى مُنْتَهَاهُ''.

(جامع الترمذي: ٢/ ٦٠ باب ماجاء في فضل الفقر)

عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں: ایک شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! بخدا! میں آپؐ سے محبت کرتا ہوں، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سوچ لو کیا کہہ رہے ہو؟'' اُس نے (سوچ کر) جواب دیا: بخدا! میں آپؐ سے محبت کرتا ہوں، یہ بات اُس نے تین مرتبہ کہی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر تجھے مجھ سے محبت ہے تو ناداری کے لیے پاکھر پہن کر تیار ہوجا؛ کیونکہ ناداری اُس شخص کی طرف جو مجھ سے محبت کرتا ہے ایسی تیزی سے آتی ہے جیسے نالہ اپنی نہایت تک تیزی سے جاتا ہے۔

تشریح:

فقر (ناداری) کی دو قسمیں ہیں: اختیاری اور اضطراری۔ اختیاری کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنی خوشی سے اس حالت کو پسند کرے اور اضطراری فقر یہ ہے کہ کوئی شخص باوجود بھوک کے انگور نہ کھائے، کھٹے ہونے کی وجہ سے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے اختیاری فقر کو پسند کیا تھا جیسا کہ ایک روایت میں مذکور ہے، آپ علیہ الصلاۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے میرے سامنے یہ بات رکھی کہ وہ میرے لیے مکہ کی وادی کے سنگریزوں کو سونے کا بنادیں یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار دیا کہ اگر آپؐ دولت مند بننا چاہیں تو مکہ کی وادی کو ہم سونے سے بھردیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کیا: میرے پروردگار! (میں اپنے لیے یہ نہیں چاہتا)؛ بلکہ میں ایک دن پیٹ بھر کھاؤں اور ایک دن بھوکا رہوں، یا فرمایا: تین دن بھوکا رہوں، یا اس کے مانند کلمہ فرمایا، پس

جب مجھے بھوک لگے تو میں آپ کے سامنے گڑگڑاؤں اور آپ کو یاد کروں اور جب میں شکم سیر ہوؤں تو آپ کا شکر بجالاؤں اور آپ کی تعریف کروں‘‘۔

بات یہ ہے کہ جس شخص کو جس سے سچی محبت ہوتی ہے وہ اُس کے احوال کے ساتھ رنگین ہوتا ہے، مشہور جملہ ہے:’’اَلرَّجُلُ عَلٰی دِیْنِ خَلِیْلِهٖ‘‘ (دوست دوست کی روِش پر ہوتا ہے)، پس جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت ہوگی اُس کا حال آپ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا ہوگا، وہ بھی دین کے کاموں میں لگ جائے گا اور دنیا کی طرف اُس کا التفات نہیں رہے گا؛ اِس لیے وہ بھی ناداری سے دوچار ہوگا، آج کل لوگ بزرگوں سے محبت کے دعوے کرتے ہیں، مگر اُن کا حال بزرگوں جیسا نہیں ہوتا، محبت کے ایسے دعوے صرف زبانی جمع خرچ ہوتے ہیں؛ اِس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابی سے فرمایا: سوچ کر کہو، کیا واقعی تمھیں مجھ سے محبت ہے؟ اُنھوں نے غور کر کے جواب دیا: واقعی مجھے آپؐ سے محبت ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو اِس محبت کا ظاہر ہونے والا اثر بتایا کہ اب ناداری کے لیے کمر کس لو۔

اللہ کی محبت کے لیے رسولؐ کی اطاعت شرط ہے:

جو اشخاص بھی اِس بات کو کہتے ہیں کہ ہم کو اللہ سے محبت ہے تو اللہ کی محبت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع شرط ہے جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ، وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

(پ:۳، سورۂ آلِ عمران، رقم الآیۃ ۳۱ رکوع نمبر ٤)

تو کہہ اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ کی تو میری راہ چلو؛ تا کہ محبت کرے تم سے اللہ اور بخشے گناہ تمھارے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے (دشمنانِ خدا کی موالات ومحبت سے منع کرنے کے بعد خدا سے محبت کرنے کا معیار بتلاتے ہیں۔ یعنی اگر دنیا میں آج کسی شخص کو اپنے مالکِ حقیقی کی محبت کا دعویٰ یا خیال ہو تو لازم ہے کہ اُس کو اتباعِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسوٹی پر کس کر دیکھ لے، سب کھرا کھوٹا معلوم ہو جائے گا، جو شخص جس قدر حبیبِ خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ پر چلتا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی روشنی کو مشعلِ راہ بناتا ہے، اُسی قدر سمجھنا چاہیے کہ خدا کی محبت کے دعوے میں سچا اور کھرا ہے اور جتنا اُس دعوے میں سچا ہوگا اُتنا ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں مضبوط ومستعد پایا جائے گا۔ جس کا پھل یہ ملے گا کہ حق تعالیٰ اُس سے محبت کرنے لگے گا اور اللہ کی محبت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی برکت سے پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے اور آئندہ طرح طرح کی ظاہری وباطنی مہربانیاں مبذول ہوں گی۔ (ماخوذ از ترجمہ شیخ الہندؒ مع فوائد عثمانیؒ)

اِس سے معلوم ہوا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جتنی زیادہ اتباع کرتا ہے وہ آپ ؐ کا محبّ ہوگا، ناداری اور تونگری اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے بہت ہی زیادہ بے رغبتی کرنے والے تھے، ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حصیر (چٹائی) پر سو گئے، جس کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو پر حصیر کے نشان پڑ گئے تھے، ایک صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم آپ ؐ کے لیے نرم بستر کا انتظام فرمادیں آپ ؐ اُس پر آرام فرمائیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے دنیا سے کیا واسطہ؟ میں تو دنیا میں اُس مسافر کی طرح ہوں جو راستہ چلتے ایک درخت کے نیچے آرام (سایہ حاصل) کرے پھر وہاں سے کوچ کر جائے اور اُس درخت کے سایہ کو چھوڑ دے۔

ناداری کی اہمیت:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا (کے پانے یا چھوٹنے) پر کبھی غمگین نہیں ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مال کا ذخیرہ بھی نہ تھا؛ بلکہ تمام کا تمام مال اللہ کے راستے میں خرچ کردیتے تھے، اور سادہ انسان کی طرح زندگی گزارتے تھے؛ اِسی لیے احادیثِ مبارکہ میں بھی ناداری اور فقر کی فضیلت وارد ہوئی ہے؛ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''فقراء جنت میں مالداروں سے پہلے داخل ہوں گے، جنت کی اکثریت فقراء کی ہوگی''؛ چونکہ فقراء کے پاس اِتنا مال نہیں ہے جو ان کو سرکش بنادے، وہ عاجزی سے، نرمی سے زندگی گزارتے ہیں۔

اسی وجہ سے آپ غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلانے والے وہ رؤساء و مالدار اور بظاہر اشراف انسان ہوتے تھے؛ جبکہ کمزور و نادار لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیتے رہے، اِسی وجہ سے جنت میں بھی انہیں کی اکثریت ہوگی۔

دنیا میں اللہ کے علاوہ ہر چیز فانی ہے:

ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشہور شاعر لبید کا کلام: ''أَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهُ بَاطِلُ'' پڑھا اور فرمایا کہ میں اِس بات کی تصدیق وتائید کرتا ہوں، ہر وہ چیز جو اللہ کے سوا ہے باطل ہے، ضائع ہونے والی ہے، اُس سے نفع کا تصور نہیں کیا جاسکتا، جو چیزیں اللہ کے لیے ہیں وہی چیزیں اُس کے مالک کو نفع دیں گی اور اُس کے لیے باقی رہیں گی، اِس کے مقابل جو چیزیں ہیں اُن کا ختم ہونا یقینی ہے جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝﴾ جو کوئی ہے زمین پر فنا ہونے والا ہے اور باقی رہے گا منہ تیرے رب کا بزرگی اور عظمت والا۔

(پ:۲۷، سورۂ رحمٰن، رقم الآیۃ:۲۶-۲۷، رکوع۲) (شیخ الہندؒ)

تشریح:

یعنی زمین وآسمان کی تمام مخلوق زبانِ حال وقال سے اپنی حاجات اُسی خدا سے طلب کرتی ہے، کسی کو ایک لمحہ کے لیے اُس سے استغناء نہیں، اور وہ بھی سب کی حاجت روائی اپنی حکمت کے موافق کرتا ہے، ہر وقت اُس کا الگ کام اور ہر روز اُس کی نئی شان ہے، کسی کو مارنا، کسی کو جلانا، کسی کو بیمار کرنا، کسی کو تندرست کر دینا، کسی کو بڑھانا، کسی کو گھٹانا، کسی کو دینا، کسی سے لینا اُس کی شؤن میں داخل ہے وقس علیٰ ھٰذا۔ (ماخوذ از فوائدِ عثمانیؒ)

دوسری جگہ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ الخ﴾

(پ:۲۷، سورۂ حدید، رقم الآیۃ: ۲۰، رکوع ۳)

جان رکھو کہ دنیا کی زندگانی یہی ہے کھیل اور تماشا اور بناؤ اور بڑائیاں کرنی آپس میں اور بہتایت ڈھونڈنی مال کی اور اولاد کی۔

(شیخ الہندؒ)

تشریح:

آدمی کو اوّل عمر میں کھیل چاہیے، پھر تماشا، پھر بناؤ سنگار (اور فیشن) پھر ساکھ بڑھانا اور نام ونمود حاصل کرنا، پھر موت کے دن قریب آئیں تو مال واولاد کی فکر کہ پیچھے میرا گھر بار بنا رہے اور اولاد آسودگی سے بسر کرے؛ مگر یہ سب ٹھاٹھ سامان فانی اور زائل ہیں۔ جیسے کھیتی کی رونق وبہار چندروزہ ہوتی ہے، پھر زرد پڑ جاتی ہے اور آدمی اور جانور اُس کو روند کر چورا کر دیتے ہیں، اُس شادابی وخوبصورتی کا نام ونشان نہیں رہتا، یہ ہی حال دنیا کی زندگانی اور اُس کے ساز وسامان کا سمجھو کہ وہ فی الحقیقت ایک دغا کی پونجی اور دھوکے کی شئی ہے۔ آدمی اِس کی عارضی بہار سے فریب کھا کر اپنا انجام تباہ کر لیتا ہے؛ حالانکہ موت کے بعد یہ چیزیں کام آنے والی نہیں، وہاں کچھ اور ہی کام آئے گا، یعنی ایمان اور عملِ صالح۔ جو شخص دنیا سے یہ چیز کما کر لے گیا سمجھو بیڑا پار ہے، آخرت میں اس کے لیے مالک کی خوشنودی ورضامندی اور جو دولتِ ایمان سے تہی دست رہا اور کفر وعصیان کا بوجھ لے کر پہنچا اُس کے لیے سخت عذاب اور جس نے ایمان کے باوجود اعمال میں کوتاہی کی اُس کے لیے جلد یا بدیر دھکے مکّے کھا کر معافی ہے، دنیا کا خلاصہ وہ تھا آخرت کا یہ ہوا۔ (ماخوذ از فوائد عثمانی)

تو معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص وصف اختیاری فقر تھا، اور جو شخص بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا دعویٰ کرتا ہے وہ بھی اُسی میں مبتلا ہوگا؛ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اُس شخص کی طرف جو مجھ سے

محبت کرتا ہے فقر اتنا تیزی سے آئے گا جتنا تیزی کے ساتھ پانی اُونچائی سے ڈھلان کی طرف آتا ہے اور یہ عام بات بھی نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرے اور جنت میں داخل ہوجائے، اُس کے لیے درمیان میں کٹھن راستہ ہے جو بغیر مشقت کے پار نہیں ہوسکتا ہے، اسی کو ربِّ ذوالجلال نے ارشاد فرمایا:

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ○﴾

(پ:٤، سورۂ آلِ عمران، رقم الآیة۱٤۲، رکوع۱٤)

کیا تم کو خیال ہے کہ داخل ہوجاؤ گے جنت میں اور ابھی تک معلوم نہیں کیا اللہ نے جو لڑنے والے ہیں تم میں اور معلوم نہیں کیا ثابت قدم رہنے والوں کو۔

(شیخ الہندؒ)

تشریح:

یعنی جنت کے جب اعلیٰ مقامات اور بلند درجات پر خدا تم کو پہنچانا چاہتا ہے کیا تم سمجھتے ہو کہ بس یوں ہی آرام سے وہاں جا پہنچیں گے اور خدا تمہارا امتحان لے کر یہ نہ دیکھے گا کہ تم میں کتنے خدا کی راہ میں لڑنے والے اور کتنے لڑائی کے وقت ثابت قدم رہنے والے ہیں، ایسا خیال نہ کرنا۔ مقاماتِ عالیہ پر وہی لوگ فائز کیے جاتے ہیں جو خدا کے راستہ میں ہر طرح کی سختیاں جھیلنے اور قربانیاں پیش کرنے کے لیے تیار ہوں، سو یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا، ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں۔ (ماخوذ از فوائدِ عثمانی)

ہم دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت ہم کو بھی پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سچا عشق اور محبت نصیب کرے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں سے سرِ مو انحراف سے محفوظ رکھے، آمین

❑❖❑

اصلاحِ معاشرہ

بین مذہبی شادی کے واقعات اور اُن کا تدارک

از قلم: فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی، ترجمان و سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

سنگھ پریوار کے لوگوں کو ہمیشہ مسلم مخالف ایجنڈا چاہیے، اُس کے لیے وہ موقع بہ موقع مختلف مسائل اُٹھاتے رہتے ہیں، ادھر ان کے بعض قائدین ہندو لڑکوں کو ترغیب دے رہے ہیں کہ وہ مسلمان لڑکیوں کو اپنے نکاح میں لائیں؛ تاکہ ان کے ذریعہ ہندو نسل چلے، یہ ایک جذباتی بات ہے جو ہندو نوجوانوں میں گرم جوشی پیدا کرتی ہوگی؛ اِس لیے اس پر ''جے شری رام'' کے نعرے بھی لگتے ہیں اور مسلمانوں کے جذبات کو بھی اس سے یقیناً ٹھیس پہنچتی ہے اور یہی ان کا مقصد ہے؛ حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ واقعات دونوں طرح کے پیش آتے ہیں، غیر مسلم لڑکیوں کے مسلم لڑکوں سے نکاح کے بھی، ایسی صورتوں میں عام طور پر یہ لڑکیاں اسلام قبول کر لیتی ہیں اور چونکہ مسلم سماج میں اب بھی ہندو سماج کی طرح ذات پات کا تصور نہیں پایا جاتا ہے؛ اِس لیے وہ مسلم سماج کا حصہ بن جاتی ہیں، نہ لڑکیوں کو دشواری پیش آتی ہے اور نہ لڑکے کے خاندان کو، یہ بھی ایک سچائی ہے کہ پیار و محبت کے جال میں پھنس کر بعض مسلمان لڑکیاں بھی غیر مسلم لڑکوں کے ساتھ چلی جاتی ہیں، ایسے واقعات میں دو طرح کے نتائج سامنے آتے ہیں، کبھی تو وہ لڑکے خود مسلمانوں کے ماحول سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیتے ہیں؛ چنانچہ مسلم سماج میں ایسے بہت سے نو مسلم داماد مل جائیں گے؛ لیکن بعض واقعات ایسے بھی پیش آتے ہیں جن میں مسلمان لڑکی اپنا مذہب بھی تبدیل کر لیتی ہے اور غیر مسلم سماج کا حصہ بن جاتی ہے، کبھی تو ان کا یہ رشتہ قائم رہتا ہے اور بہت سی دفعہ علاحدگی، خودکشی اور موت پر ختم ہوتا ہے؛ کیونکہ ہندو سماج اپنی قوم ہی کے دوسرے خاندانوں سے نکاح کو گوارا نہیں کرتا؛ چہ جائیکہ وہ اپنے گھر میں کسی مسلمان لڑکی کی آمد کو قبول کر لے۔

اس وقت اس مسئلہ پر کافی لکھا اور بولا جا رہا ہے؛ لیکن اس سلسلہ میں دو باتیں قابلِ توجہ ہیں: اوّل: یہ کہ مسلمان لڑکیوں کے غیر مسلم لڑکوں کے ساتھ جانے کے واقعات میں کتنی سچائی ہے اور کتنا مبالغہ ہے؟ دوسرے یہ کہ جتنی سچائی ہے اُس کے تدارک کے سلسلے میں ہماری کیا ذمہ داریاں ہیں؟

پہلے نکتہ کے سلسلے میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں حقیقت کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا جا رہا ہے، ایسی باتوں کا چونکہ مخاطب پر بڑا اثر پڑتا ہے؛ اِس لیے بے تحقیق بات کہہ دی جاتی ہے اور پھر اس بات کو بغیر تحقیق

وتجزیہ کے آگے نقل کیا جاتا ہے، جو تقریر وتحریر میں نمک مرچ کا کام کرتی ہے، اگر ہم غور کریں تو جس پیمانے پر یعنی لاکھوں کی تعداد میں مسلمان لڑکیوں کے غیر مسلم لڑکوں کے ساتھ جانے کی بات کہی جارہی ہے، یہ بالکل قابلِ فہم نہیں ہے۔

ایک تو: غیر مسلموں کے یہاں شادی بیاہ کے معاملہ میں ذات پات کا اتنا گہرا تصور ہے کہ اُونچی ذات والے نیچی ذات کی لڑکی کو اور برہمن وراجپوت، دَلت طبقہ کی لڑکیوں کو کسی طور پر گوارہ نہیں کرتے، کیا عمومی طور پر یہ سماج مسلمان لڑکیوں کو بہ طور منکوحہ گوارا کرسکتا ہے؟

دوسرے: مسلمانوں میں جو غریب ومفلس طبقہ ہے، وہی لالچ میں مبتلا ہو کر غیر مسلم لڑکوں کے دام میں جاتا ہے اور لڑکیاں ان کا شکار ہو جاتی ہیں، یہ طبقہ عام طور پر زیادہ جہیز وغیرہ نہیں دے سکتا، اسی مجبوری کی وجہ سے ان کی شادی میں دیر ہوتا ہے اور اس تاخیر کی وجہ سے وہ شکار کر لی جاتی ہیں، ہندو سماج میں جہیز کے لین دین کی رسم بہت گہری ہے، ایک حد تک ان کا مذہب بھی اسے قبول کرتا ہے، اور اس کو بُرا نہیں سمجھا جاتا، اور یہ بات قانونِ میراث سے بھی جڑی ہوئی ہے، ہندو مذہب میں چوں کہ عورتوں کو حق میراث میں کوئی حصہ نہیں ملتا، اور اگر چہ قانونی طور پر ۱۹۵۰ء کے بعد ان کو ترکہ میں حق دیا گیا ہے؛ لیکن قدیم مذہبی روایت کی وجہ سے اس پر بہت کم عمل ہو پاتا ہے، خاص کر زرعی اراضی اور کاروبار میں تو ان کا کوئی حق ہی نہیں سمجھا جاتا ہے؛ اِس لیے داماد اپنا حق سمجھتا ہے کہ سسرال والے اس کو ایک خطیر جہیز دیں، مسلمانوں میں اگر چہ برادرانِ وطن سے متاثر ہو کر جہیز اور تلک کا رواج پڑ گیا ہے؛ مگر ہر دیندار اور باشعور مسلمان اس کو بُرا ہی سمجھتا ہے؛ اِسی لیے لین دین کی بات کو خفیہ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، بہت سے مسلمان اس رسمِ بد سے بچتے ہیں، دینی جماعتوں اور تحریکوں سے تعلق رکھنے والے نوجوان اسے باعثِ ننگ سمجھتے ہیں، یہاں تک کہ جو حضرات محتاط ہیں وہ تو ان تقریبات میں شریک بھی نہیں ہوتے، جن میں لین دین کے ساتھ شادی ہوتی ہے، ہزاروں جلسے اس بُرائی کی مذمت کے لیے منعقد ہوتے ہیں اور عوام وخواص ایسی حرکتیں کرنے والوں پر لعن طعن کرتے ہیں۔

لہٰذا اس بُرائی میں مسلمان اور غیر مسلم ایک درجہ میں نہیں ہیں، اس پس منظر میں دیکھیے تو غیر مسلم لڑکوں کو مسلمان لڑکیوں سے شادی رچانے میں کیا دلچسپی ہوسکتی ہے؟ ایسا تو ہوسکتا ہے کہ ہندوتوا کی آڑ میں سلگ کر اِکّا دُکّا ہندو نوجوان مسلمان لڑکی سے اپنا رشتہ استوار کرلے اور ایسا ہوتا آتا ہے کہ اسکول یا جائے ملازمت کی دوستی شادی میں تبدیل ہو جائے؛ لیکن عمومی طور پر غیر مسلم لڑکے مسلمان لڑکیوں کو اپنانے لگیں، یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔

تیسرے: خود غیر مسلم سماج میں غیر شادی شدہ لڑکیوں کی بڑی تعداد ہے، جو صورتِ حال مسلمانوں کے یہاں ہے، وہی ان کے یہاں ہے، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ غیر مسلم شہری اور تعلیم یافتہ آبادی میں کم بچے پیدا کرنے کا رجحان کافی بڑھ گیا ہے، مسلمان علماء جس طرح شرعی نقطۂ نظر سے اس کو منع کرتے ہیں، اُن کے یہاں ایسا نہیں ہے، سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رزاقیت کے وسیع تصور سے محروم ہیں، اور کثرتِ اولاد کو قبول کرنے کا اس سے گہرا تعلق ہے، چاہے ان کے بعض مقررین ہندو نوجوانوں کو زیادہ بچے پیدا کرنے کی دعوت دیں؛ لیکن غیر مسلم سماج عام طور پر اس جذباتی نعرہ کو قبول نہیں کرتا، وقتی طور پر نعرے لگا دینا الگ بات ہے؛ لیکن نعروں کو عمل میں لانے کا تعلق عقیدہ ویقین سے ہے، تو جب ان کے سماج میں خود لڑکیوں کے لیے جوڑے کی ضرورت ہے تو وہ کیوں اپنا بوجھ بڑھا کر دوسرے سماج کا بوجھ اُٹھانا چاہیں گے؟

چوتھے: لاکھوں مسلمان لڑکیوں کے غیر مسلم لڑکوں کے ساتھ جانے کی جو بات کہی جا رہی ہے، گرد و پیش کا ماحول بھی اس کی تصدیق نہیں کرتا ہے، اپنے اپنے خاندان میں دُور تک دیکھ جایئے، اپنے محلّہ کا جائزہ لیجیے، اپنے گاؤں پر نظر ڈالیے، شاید ہی اس طرح کا کوئی واقعہ ملے، بڑی بڑی آبادیوں اور شہروں میں اِکّا دُکّا واقعات ملتے ہیں، اگر ہیں کسی بڑے شہر میں مہینہ میں دس واقعات پیش آئیں تو سال میں ایک سو بیس واقعات ہوئے، لاکھوں کی آبادی میں اتنے واقعات کا پیش آنا بھی اگرچہ بہت تکلیف دہ ہے؛ لیکن اس کو ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد قرار دینا حد درجہ مبالغہ کی بات ہے، یہ تو ہو سکتا ہے کہ اس طرح کے واقعات میں اضافہ ہوا ہو؛ لیکن نئے نہیں ہیں؛ چونکہ لڑکیوں میں تعلیم کا رجحان بڑھ رہا ہے، بدقسمتی سے ہمارے یہاں جداگانہ نظامِ تعلیم کے ادارے بہت کم ہیں، مخلوط تعلیمی نظام کا غلبہ ہے اور پھر خواتین میں ملازمت کا رجحان بڑھا ہے اور غیر ملکی کمپنیوں کے آنے کی وجہ سے اس کے مواقع بھی بڑھے ہیں؛ اِس لیے ایسے واقعات میں دونوں طرف سے اضافہ ہوا ہے، مسلمان لڑکیوں کے غیر مسلم لڑکوں کے ساتھ جانے کے بھی اور غیر مسلم لڑکیوں کے مسلم لڑکوں کی طرف آنے کے بھی، یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ''لَو جہاد'' کے خلاف نعرے لگ رہے ہیں اور پورے ملک میں اس کے لیے تحریک چلائی جا رہی ہے؛ اِس لیے اس کو بالکل یک طرفہ انداز سے پیش کرنا مناسب عمل نہیں ہے۔

سنگھ پریوار کے لوگ سمجھتے ہیں کہ نہ مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد کو سمندر میں بہایا جا سکتا ہے نہ اُن کو کسی ملک میں بھیجا جا سکتا ہے اور نہ ان کو تہِ تیغ کیا جا سکتا ہے؛ اِس لیے وہ وقتاً فوقتاً خوں ریز فسادات کراتے ہیں، اُن کی تائید سے ہجومی قتل کے واقعات پیش آتے ہیں، پھر ایسے واقعات کو میڈیا پر دکھایا جاتا ہے اور اس پر فخر کیا جاتا ہے، مقصد مسلمانوں کو خوف زدہ کرنا ہے، یہ جو مسلمان لڑکیوں کے غیر مسلم لڑکوں کے ساتھ جانے کی بات بار بار کہی

جارہی ہے، یہ بھی اسی قبیل سے ہے؛ تاکہ مسلمانوں کے حوصلے ٹوٹ جائیں، ہم اس غیر تحقیق شدہ بات پر گرم تقریریں کرکے اور مبالغہ آمیز تحریریں لکھ کر؛ نیز سوشل میڈیا پر پھیلا کر ان کے مقصد کو تقویت پہنچا رہے ہیں، اور اس سے مسلمانوں کے حوصلے پست ہو رہے ہیں، مسلمان علماء اور قائدین کو ضرور اس پر توجہ دینی چاہیے۔

پانچویں: کسی مسلمان لڑکی کا غیر مسلم لڑکے کے ساتھ چلا جانا الگ بات ہے اور مرتد ہو جانا الگ بات ہے، غیر مسلم لڑکے کے ساتھ چلا جانا یقیناً بہت بڑا گناہ ہے؛ مگر ارتداد کا مطلب مسلمان ہو جانے کے بعد کفر کو اختیار کر لینا ہے، مرتد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کے ایک ہونے کا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول اور آخری نبی ہونے کا، قرآن مجید کے کتاب اللہ ہونے کا اور آخرت کا انکار کر جائے، وہ بتوں کو خدا یقین کرنے لگے، اس پہلو سے دیکھیں تو بہت سی لڑکیاں جو غیر مسلم لڑکوں کے ساتھ چلی جاتی ہیں، وہ وقتی جذبات کے تحت اگرچہ اس غلطی کا ارتکاب کر لیتی ہیں؛ لیکن وہ مکمل طور پر اسلام سے براءت کا اظہار نہیں کرتیں، ان کے دل میں ایمان کی چنگاری دبی ہوتی ہے، خود میرے پاس بعض ایسے معاملات آئے کہ جب بین مذہبی شادی کرنے والے جوڑے کو سمجھایا گیا تو انہوں نے کہا کہ ہم نے اپنا دین نہیں بدلا ہے، ہم دونوں نے طے کیا ہے کہ ہم اپنے اپنے مذہب پر قائم رہیں گے، اپنے اپنے خاندان سے تعلق بھی باقی رکھیں گے؛ لیکن ازدواجی رشتہ میں بندھے رہیں گے، ان کی یہ بات یقیناً صد فیصد ناقابلِ قبول ہے، شریعت میں قطعاً اِس بات کی اجازت نہیں ہے؛ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایسے مسلمان لڑکے یا لڑکی کو گنہگار اور فاسق وفاجر تو کہہ سکتے ہیں؛ مگر ان پر مرتد ہونے کا حکم نہیں لگا سکتے۔

حاصل یہ ہے کہ لاکھوں مسلمان لڑکیوں کے غیر مسلم لڑکیوں کے ساتھ جانے کی بات کسی بھی طرح حقیقت کے مطابق نہیں ہے، اس کو مبالغہ آمیزی کیساتھ بولنے اور لکھنے سے مسلمانوں کے حوصلے پست ہوتے ہیں اور سنگھ پریوار کے اِرادوں کو تقویت پہنچتی ہے؛ اِس لیے نہ ایسی باتیں بار بار کہنی چاہئیں اور نہ ایسی باتوں کو پھیلانا چاہیے؛ البتہ اگر اس طرح کے دو چار واقعات بھی پیش آئیں تو وہ بھی بہت تکلیف دہ ہیں، اور وہ اس لائق نہیں ہیں کہ انہیں نظر انداز کر دیا جائے، آئندہ سطور میں اسی سلسلے میں بعض تجاویز پیش کی جارہی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو نعمتیں دی ہیں اُن میں ایمان اور زندگی کے بعد سب سے بڑی نعمت والدین اور اولاد ہیں، والدین کی حیثیت ایک ایسے درخت کی ہوتی ہے جو اپنی اولاد کو سایہ فراہم کرتا ہے، جیسے درخت دھوپ کی تپش کو برداشت کرتا ہے اور اپنے سائے میں بیٹھنے والوں کو ٹھنڈا ماحول فراہم کرتا ہے، اِسی طرح ماں باپ حالات کی تپش کو برداشت کرتے ہوئے اپنے بچوں کو ٹھنڈا سایہ فراہم کرتے ہیں، اور بچے کیسے بھی ہوں وہ

بھرپور پیار ومحبت کے ساتھ اُن کی پرورش کرتے ہیں، اِسی طرح اولاد انسان کی زندگی کا سب سے قیمتی پھل ہوتا ہے، اس کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں اور وہ بُڑھاپے میں ماں باپ کے لیے سہارا بنتے ہیں، ماں باپ کی اہمیت ان بچوں سے پوچھیے جو باپ یاماں کی دولت سے محروم ہوگئے ہوں اور یتیمی کا داغ سہہ رہے ہوں، اور اولاد کی اہمیت ان لوگوں سے پوچھیے جن کواللہ نے اس نعمت سے محروم رکھا ہے، وہ کس قدر تڑپتے ہیں، اپنے آپ کوتنہا محسوس کرتے ہیں اوراپنے مستقبل کے بارے میں خوف وتشویش میں مبتلا رہتے ہیں۔

اسی لیے والدین اور اولاد دونوں کی ایک دوسرے سے متعلق بڑی ذمہ داریاں ہیں، پہلا مرحلہ والدین کی ذمہ داریوں کا آتا ہے؛ کیوں کہ اس وقت بچے ان کے ضرورت مند ہوتے ہیں، دوسرا مرحلہ اولاد کی ذمہ داریوں کا آتا ہے؛ کیوں کہ جب جوانی ڈھلتی ہے اور ماں باپ بوڑھاپے میں قدم رکھتے ہیں تو اب ان کوقدم قدم پر اولاد کی ضرورت ہوتی ہے، اگر ماں باپ نے اپنی ذمہ داریاں صحیح طور پرادا کی ہوں تو عام طور پران کا بڑھاپا بھی بہتر گزرتا ہے، بچے ان کے قدرشناس ہوتے ہیں، ان کے ایک ایک حکم کی تعمیل کے لیے کھڑے رہتے ہیں، ان کی ایک ایک ضرورت کو پوری کرنا اپنے لیے سعادت کی بات سمجھتے ہیں، ان کی خوش اخلاقی، دینداری اور پاکیزہ زندگی سے والدین کا دل بھی خوش ہوتا ہے، اوران کوایک روحانی سکون ملتا ہے کہ ہم ایسی اولاد کوچھوڑ کر جارہے ہیں جو ان شاءاللہ آخرت میں نفع کا سودا ثابت ہوں گی؛ اِس لیے والدین سے جو ذمہ داریاں متعلق ہیں اُن کی خصوصی اہمیت ہے، وہ آج درخت لگائیں گے تو کل اس کا پھل کھاسکیں گے۔

والدین کی ذمہ داریوں کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بڑا ہی واضح اور جامع اُصول مقرر فرمایا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”آگاہ ہوجاؤ! تم سب کے سب چرواہے یعنی ذمہ دار ہو، جن لوگوں کی ذمہ داری تم سے متعلق ہے، تم سب اُن کے بارے میں جواب دہ ہو، امیر اپنے زیرامارت لوگوں کا ذمہ دار ہے، اوران کے بارے میں جواب دہ ہے، ہر شخص اپنے گھر کے لوگوں کا ذمہ دار ہے اوران کے بارے میں جواب دہ ہے، عورت اپنے شوہر کے مال اور اُس کی اولاد کے بارے میں ذمہ دار ہے اوران کے بارے میں جواب دہ ہے، غلام اپنے مالک کے مال کے سلسلے میں ذمہ دار ہے اوراس کے بارے میں جواب دہ ہے، خبردار! تم سب کے سب اپنے اپنے دائرہ میں ذمہ دار ہو اور اپنے ماتحتوں کے بارے میں جواب دہ ہو“۔ (بخاری عن عبداللہ بن عمرؓ، حدیث نمبر:٢۵١۴)

یہ نہایت ہی جامع ارشاد ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر شخص کو متوجہ فرمایا ہے کہ جو لوگ اس کے ماتحت

ہیں وہ ان کا ذمہ دار ہے، اور اس ذمہ داری کے بارے میں اللہ کے پاس باز پُرس ہوگی، اگر اس نے اپنی ذمہ داری پوری نہیں کی تو اس کو اس کی سزا دی جائے گی، اس حدیث میں ذمہ دار شخص کے لیے ''راعی'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور جو اس کے ماتحت ہوں اُن کو ''رعیت'' کہا گیا ہے، ''راعی'' کے معنیٰ ''چرانے والے'' کے ہیں اور جن جانوروں کو وہ چراتا ہے اُن کو رعیت کہتے ہیں، یہ ایک بہت ہی بلیغ تعبیر ہے، چرواہا جن جانوروں کو چَراتا ہے، سختی کے ساتھ اُن کی نگرانی کرتا ہے، کہیں سانپ ان کو ڈس نہ لیں، کہیں کتے ان پر حملہ نہ کردیں، کہیں کوئی جانور دُور بھاگ کر اُس کی نظروں سے اوجھل نہ ہوجائے، وہ جانوروں کو قابو میں رکھنے کے لیے سختی بھی کرتا ہے، پھٹکار بھی لگاتا ہے، ان کی قوتِ برداشت کا لحاظ رکھتے ہوئے مار پیٹ بھی کرتا ہے، اور ان سے غایت درجہ محبت بھی کرتا ہے، ان کے چارے اور پانی کی فکر کرتا ہے، اس کو ٹھنڈ، گرمی اور بارش سے بچاتا ہے، علاج کراتا ہے، غرض کہ اس کی تمام ضروریات کا خیال رکھتا ہے۔

جب ایک شخص کو اپنے گھر کے بارے میں چرواہا قرار دیا گیا تو اس میں اِس بات کا بھی اشارہ موجود ہے کہ جو فکر ایک چرواہے کو اپنے جانوروں کے بارے میں ہوتی ہے، وہی ایک سربراہِ خاندان کو اپنے خاندان کے بارے میں ہونی چاہیے، اگر وہ اس میں کوتاہی کرے گا تو اللہ تعالیٰ کے پاس جواب دہ ہوگا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی واضح فرمایا کہ یہ ذمہ داری اور جوابدہی صرف مرد ہی کی نہیں ہے، عورت کی بھی ہے، ایک عورت اپنے زیر پرورش بچوں کی ذمہ دار ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس سلسلے میں جواب ہے، عورت پر بچوں کے اخراجات کی ذمہ داری نہیں ہے؛ لیکن تعلیم وتربیت کی ذمہ داری میں وہ بھی شریک ہے۔

اولاد کی ضروریات دو قسم کی ہیں، ایک: دنیوی زندگی کی ضروریات جو مسلمان بھی اپنے بچوں کو مہیا کرتا ہے اور غیر مسلم بھی؛ بلکہ حیوانات بھی اپنے چھوٹے بچوں کی غذا کی فکر کرتے ہیں، مائیں دودھ پلاتی ہیں اور باپ ان کی حفاظت کرتا ہے، دوسری ضرورت اُخروی زندگی سے متعلق ہے، اولاد میں اللہ کی معرفت ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہو، ایمان ان کے دل ودماغ میں جاگزیں ہوجائے، ان کو اچھے اعمال کا عادی بنایا جائے، بُری باتوں سے روکا جائے، یہ اولاد کا ایک خصوصی حق ہے، یہ انسان پر خاص کر مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں اس خصوصی حق کا بہت مؤثر انداز میں ذکر فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

''اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو اس آگ سے بچاؤ، جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں، اس آگ پر سخت مزاج اور درشت اخلاق والے فرشتوں کی ڈیوٹی ہوگی، جو اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کریں گے اور جو کچھ حکم دیا جائے گا اُسے بجالائیں گے''۔ (تحریم:٦)

افسوس کہ آج کل لوگ اپنے بچوں کی مادی ضرورتوں کی تو پوری فکر کرتے ہیں، بہتر سے بہتر کھلانے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی خواہش کے مطابق کپڑے پہنانے کی سعی کرتے ہیں، بیٹیوں کو کچھ اس طرح جہیز دیتے ہیں کہ گویا زندگی بھر کی ضرورت پورکر دیں گے؛ مگر ان کی آخرت کو سنوارنے اور آنے والی زندگی کو اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بچانے کی کوئی فکر نہیں کرتے، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے ملک میں مسلمان لڑکیوں کے غیر مسلموں کیساتھ ازدواجی رشتہ استوار کرنے کے واقعات پیش آرہے ہیں، اِس سلسلے میں سب سے بڑی ذمہ داری لڑکیوں کے والدین کی ہے، وہ اگر اپنی ذمہ داریوں کو ادا کریں تو یہ نوبت نہیں آئے؛ اِسی لیے:

(۱) والدین کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ لڑکیاں ہوں یا لڑکے، اُن کی بنیادی دینی تعلیم کا انتظام کریں، جتنی اہمیت کے ساتھ بچوں کو اسکولی تعلیم دلاتے ہیں اُتنی ہی اہمیت کیساتھ مکتب بھی بھیجیں، جہاں وہ قرآنِ مجید، اسلامی عقائد، عبادات و معاشرت اور معاملات کے ضروری احکام اور سیرتِ نبویؐ کی تعلیم حاصل کریں، یہ دینی تعلیم کم سے کم ساتویں جماعت تک عصری تعلیم کے ساتھ جاری رکھی جائے، اس کی بہتر صورت مکتب کا نظام ہے، اگر محلّہ کی مسجد میں مکتب کا انتظام نہ ہو تو خاندان کے بچوں اور بچیوں کو جوڑ کر گھر میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے مکتب کا انتظام کیا جائے، ہمارے روایتی مکاتب میں عموماً بچوں کو چند سورتیں اور کچھ دعائیں یاد کرائی جاتی ہیں، یہ کافی نہیں ہے، ان کو ایمانیات کے بارے میں بھی بتانا چاہیے، عقیدۂ توحید سے کیا مراد ہے؟ اسلام اور کفر میں کیا فرق ہے؟ اللہ کی کتاب اور اس کے رسولوں کی انسانیت کو کیا ضرورت ہے؟ ایک غیر مسلم سے ہمارا کیا تعلق ہونا چاہیے؟ اس میں یہ بھی واضح کیا جائے کہ انسانی مسائل میں وہ ہمارے بھائی ہیں؛ لیکن ان کیساتھ کسی مسلمان مرد یا عورت کا رشتۂ ازدواج نہیں ہوسکتا۔

بچوں کی اس طرح سے تربیت کرنا ماں باپ کا فریضہ ہے، چاہے مسجد کے مکتب کے ذریعہ ہو یا گھر کے مکتب کے ذریعہ یا ٹیوشن کے ذریعہ، اگرچہ ٹیوشن سے وہ فائدہ حاصل نہیں ہو پاتا جو مدرسہ اور مکتب سے حاصل ہوتا ہے؛ لیکن اگر اس کے سوا کوئی راستہ نہ ہو تو ٹیوشن کے لیے اچھے استاذ کو رکھنا چاہیے، ایسا نہیں کہ کم فیس پر راضی ہونے والے کسی حافظ صاحب کو رکھ لیا جائے، ایسے سستے ٹیوٹر رسمی تعلیم دے کر شاید آپ کو خوش کر دیں؛ لیکن وہ بچوں کی فکر پر اثر انداز نہیں ہوسکتے۔

(۲) دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ ساتویں کلاس کے اُوپر لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ایسے تعلیمی اداروں کا انتخاب کرنے کی کوشش کی جائے جس میں دونوں کے کلاس روم الگ الگ ہوں، بچوں اور بچیوں کے لیے عام طور پر یہ زمانہ نوجوانی کا ہوتا ہے، اس میں بہکنے اور بگڑنے کا اندیشہ زیادہ ہوتا ہے، اگر جائزہ لیا

جائے تو نوجوانوں میں جو بے راہ روی ہوتی ہے اُس کا بنیادی سبب مخلوط تعلیم ہے، یہ نہ صرف اخلاق کو نقصان پہنچاتی ہے؛ بلکہ تعلیمی یکسوئی میں بھی خلل پیدا کرتی ہے؛ اِسی لیے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ لڑکیوں کے علاحدہ تعلیمی ادارے قائم کرنے چاہئیں، دینی تنظیموں کو، بڑے مدارس کو، شہر کی کثیر الوسائل مسجد کو ایسے اسکول قائم کرنے چاہئیں، اِسی طرح مسلمان تاجروں اور کاروباریوں کو تعلیم کے میدان میں اپنا سرمایہ لگانا چاہیے، اِس سے ان شاء اللہ ان کو مالی منفعت بھی حاصل ہوگی اور آخرت کا نفع بھی، بہر حال لرکیوں کو حتی المقدور مخلوط تعلیمی اداروں میں تعلیم دلانے سے بچنا چاہیے، اگر ایسا ادارہ آپ کے محلّہ میں نہ ہو، فاصلہ پر ہو تو ٹرانسپورٹ کا خرچ برداشت کیجیے؛ لیکن بچیوں کو ان اداروں تک پہنچائیے، اگر آپ کے خیال میں اس کا تعلیمی معیار کم ہو تو آپ ان اداروں میں پڑھاتے ہوئے الگ سے کوچنگ کر کے اس کمی کو پورا کرائیے؛ اگر فاصلاتی طرزِ تعلیم کے ذریعہ تعلیم دلانا ممکن ہو تو اسی راستہ کا انتخاب کیا جائے؛ لیکن ان کو مخلوط تعلیمی اداروں سے بچانے کی بھرپور کوشش کی جائے۔

(۳) تیسری ذمہ داری یہ ہے کہ اسکول اور کالج جانے والی بچیوں کی مسلسل نگرانی کی جائے، ماں باپ کو کوشش کرنا چاہیے کہ وہ آفس جانے کی طرح اِس بات کو بھی ضروری سمجھیں کہ خود سے اپنی بچیوں کو اسکول لے جائیں اور اسکول کا وقت ختم ہونے کے بعد خود اسکول جا کر اپنی بچیوں کو واپس لائیں، یوں ہی بچیوں کے خود جانے یا آٹو وغیرہ سے بھیج دینے کو کافی نہ سمجھیں، ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ لڑکے اور لڑکیاں گھروں سے نکلے اور اسکول نہیں پہنچے اور یہاں وہاں وقت گزار کر واپس آ گئے، اگر ماں باپ دونوں مل کر اس ذمہ داری کو ادا کرنا چاہیں تو اوقات کی تنظیم کے ساتھ اس کو انجام دے سکتے ہیں۔

(۴) زیرِ تعلیم لڑکیوں کے سلسلے میں نگرانی کے پہلو سے والدین کی چوتھی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ہفتہ میں کم سے کم ایک بار اسکول جا کر پرنسپل سے اپنی بچی کی تعلیم اور ان کی حاضری کے بارے میں دریافت کریں؛ کیوں کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ سرپرست نے بچوں کو اسکول میں چھوڑ دیا، پھر بچے وہاں سے پارکوں میں گھومنے چلے گئے اور اسکول کا وقت ختم ہونے سے پہلے اسکول پہنچ گئے؛ اس لیے ہمہ وقتی نگرانی کی ضرورت ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب خود اسکول جا کر، یا ذمہ داروں کو فون کر کے اوقاتِ تعلیم میں ان کے موجود رہنے کے بارے میں دریافت کیا جائے، اس میں مشقت ضرور ہے؛ لیکن جو ماں باپ ساری مشقتیں اپنے بچوں کے آرام کے لیے برداشت کرتے ہیں، کیا وہ آخرت کی نہ ختم ہونے والی آرام وراحت کے لیے اور اپنے اپنے بچوں کی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے یہ مشقت برداشت نہیں کر سکتے؟

(۵) پانچویں: بچوں کی تعلیم وتربیت کو صرف استاد کے حوالے کردینا اولاد کے ساتھ بھی ناانصافی ہے اور ان کے اساتذہ کے ساتھ بھی، ضروری ہے کہ ہم اپنے گھروں میں بھی بچوں کی نگرانی کریں، بلاضرورت ان کے ہاتھ میں موبائل دینے سے بچیں، غیرشادی شدہ لڑکوں اور لڑکیوں کو سونے کے لیے تنہا کمرہ نہ دیں، اگر دو تین بھائی ہوں تو ایک ہی کمرہ میں ان کا الگ الگ بستر ہو؛ لیکن وہ رہیں ایک ہی کمرے میں، اور اگر ایک سے زائد لڑکیاں ہوں تو ان کی رہائش کے لیے بھی اسی طرح کا انتظام کیا جائے، تعلیمی ضرورت کے لیے موبائل کے بجائے لیپ ٹاپ رکھا جائے، اور وہ ایسی کھلی جگہ پر ہو، جہاں گھر کے لوگوں کی عمومی آمدورفت ہو، بچوں کے فون پر بھی نظر رکھی جائے، وقتاً فوقتاً ان کے فون چیک کیے جائیں؛ تاکہ ان کے روابط کا اندازہ ہوسکے، بچوں کو بالکل آزاد چھوڑ دینا، ان پر روک ٹوک نہ کرنا، ان کی نگرانی نہ کرنا اسلامی تعلیمات کے بھی خلاف ہے اور بچوں کے مفادات کے بھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا:

''اللہ تعالیٰ اس بندے پر رحم فرمائے جو اپنے گھر میں کوڑا لٹکا کر رکھے؛ تاکہ وہ اپنے بچوں کو صحیح راستے پر قائم رکھ سکے''۔

آج کل اس معاملے میں لوگوں کے اندر افراط وتفریط ہے، بعض لوگ بچوں کی اصلاح میں اتنی شدت برتتے ہیں کہ ان کی ناشائستہ ڈانٹ ڈپٹ اور مارپیٹ سے بچوں میں ضد پیدا ہوجاتی ہے، جس بات سے روکا جائے، وہ اسے اصرار کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں، اور بعض حضرات اتنے نرم ہوجاتے ہیں کہ وہ بچوں کی تنبیہ کو تہذیب کے خلاف سمجھتے ہیں، یہ دونوں باتیں غلط ہیں، تربیت میں سختی بھی ضروری ہے اور اعتدال کے ساتھ بچوں کی عزتِ نفس کا لحاظ رکھتے ہوئے سرزنش بھی۔

(۶) یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ ہمارے سماج میں عام طور پر قریب البلوغ بچوں اور بچیوں سے اُن مسائل کے بارے میں بات نہیں کی جاتی ہے جن سے وہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد دوچار ہوں گے، بچوں اور بچیوں کو سمجھانا چاہیے کہ وہ کس طرح اپنے آپ کو پاک دامن رکھیں، غیرمحرم صنف مخالف سے دُوری اختیار کریں، فحش لٹریچر سے اپنے آپ کو بچائیں، اپنی رات کو نیند، عبادت اور دینی کتابوں کے مطالعہ میں مشغول کریں، اچھے دوستوں/سہیلیوں کی دوستی اختیار کریں، خاص طور پر لڑکیوں کو بتانا چاہیے کہ کس طرح ہوس پرست مسلم اور غیرمسلم لڑکے پیار ومحبت کا نام لے کر اپنے جال میں پھنسانا چاہتے ہیں؛ حالانکہ ان کو محبت نہیں ہوتی، صرف اپنی ہوس پوری کرنا چاہتے ہیں، اور پھر لڑکیوں کو ایسے مقام پر لاکر چھوڑ دیتے ہیں جہاں ان کا مستقبل تاریک ہی تاریک ہوتا ہے اور ان کے لیے زندگی بوجھ بن جاتی ہے، لڑکیوں کو ایسے واقعات بھی سنانا

چاہیے جن میں اوباش لڑکوں نے مسلم لڑکیوں کو اُکسا کر ان سے شادی رَچالی اور یا تو ان کو قتل کر دیا یا پھر بے سہارا بنا کر چھوڑ دیا۔

نکاح کے لیے مذہبی ہم آہنگی کس قدر ضروری ہے، اِس پر بچوں اور بچیوں سے کھل کر بات کرنی چاہیے اور صحیح صورتِ حال سمجھانی چاہیے؛ کیونکہ صرف ڈانٹ ڈپٹ سے ذہن کو بدلا نہیں جا سکتا، بین مذہبی شادیوں کے واقعات تو پہلے بھی ہوتے تھے؛ لیکن بہت کم ہوتے تھے اور یہ زیادہ تر تعلیم اور ملازمت کے مخصوص ماحول کا نتیجہ ہوتے تھے؛ لیکن موجودہ حالات میں فرقہ پرست طاقتیں اس کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہی ہیں؛ اِس لیے ایسے واقعات میں اضافہ ہوا ہے، اس پر خصوصی توجہ کرنا وقت کا اہم فریضہ ہے۔

❑❖❑

اصلاحِ معاشرہ

تین اہم نصیحتیں

ازقلم: حضرت مولانا مفتی سیّد محمد عفان صاحب منصور پوری (صدرالمدرسین جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد، امروہہ)

عن أبي هريرةؓ عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من كان يومن بالله واليوم الآخر فليكرم جاره ومن كان يومن بالله واليوم الآخر فليكرم ضيفه ومن كان يومن بالله واليوم الآخر فليقل خيرا اليصمت. (رواه البخاری و مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک جامع ارشاد گرامی نقل فرمایا ہے: جوشخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنے والا ہے، اس کو اپنے پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک اور بہترین برتاؤ کرنا ہوگا، دوسرے نمبر پر فرمایا: جوشخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنے والا ہے، اُس کو مہمانوں کی ضیافت ومہمانی کرنی ہوگی، ان کا اعزاز واکرام کرنا ہوگا، اور تیسرے نمبر پر فرمایا جوشخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنے والا ہو اس کو اپنی زبان سے یا تو اچھے جملے ادا کرنے ہوں گے یا زبان پر تالا لگانا ہوگا اور خاموشی کو اختیار کرنا ہوگا، بولے تو صحیح بولے؛ ورنہ سکوت وخاموشی کو اختیار کرے۔

یہ تین جامع ہدایات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث پاک میں بیان فرمائیں، دو کا تعلق تو انسان کے عمل وفعل کے ساتھ ہے، اور ایک کا تعلق انسان کے قول اور زبان کے ساتھ ہے، پڑوسیوں سے حسنِ سلوک کرنے والا انسان بداخلاقی سے پاک ہوتا ہے، اچھی عادات وصفات کا عادی ہوتا ہے تبھی وہ پڑوسیوں کی خبرگیری کرنے والا، ان کی نگہ داشت کرنے والا، اور ان کی ضرورت کو اپنی ضرورت سمجھنے والا بنتا ہے، تو پہلی ہدایت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیغام دیا کہ حسنِ اخلاق کو اپنانے والے اور اچھی صفات وخوبیوں کو اپنے اندر لانے والے بنو۔

دوسری ہدایت مہمانوں کی ضیافت اور اکرام کرنے کی فرمائی، یہ عادت انسان کو فضائل وکمالات اور بلندیوں سے مالامال کرتی ہے، یہ وہ شان ہے جس کا مظاہرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ نے فرمایا ہے، جو اس صفت اور خوبی کا حامل ہوگا اللہ اس کو بزرگی، برتری دنیا کے اندر بھی عطا فرمائیں گے اور آخرت کے اندر بھی عطا فرمائیں گے، اس دوسری ہدایت سے یہ نصیحت کی گئی کہ تم اپنی زندگی کو فضائل وکمالات سے آراستہ کرنے والے بنو۔

زبان کی قدر کرو

تیسری اہم ہدایت یہ کی گئی کہ زبان اللہ نے عظیم الشان نعمت کے طور پر تم کو مرحمت فرمائی ہے، اس کی قدر کرنے والے بنو اور اس کا صحیح استعمال کرنے والے بنو، یوں تو اللہ کی ہر ہر نعمت بے بدل اور بے مثال ہے، اس کی کوئی قیمت نہیں لگائی جاسکتی، اس کا کوئی عوض نہیں دیا جاسکتا؛ لیکن زبان کی شکل میں اللہ نے جو نعمت انسان کو عطا فرمائی ہے، اُس کی قدر و منزلت کا تو انسان اندازہ ہی نہیں لگا سکتا، کتنا استعمال کرتا ہے انسان اپنی زبان کو، پیدائش سے لے کر موت تک برابر انسان کی زبان چلتی رہتی ہے؛ لیکن اللہ کی قدرت ہے کہ اس کو نہ کسی تیل کی ضرورت ہوتی ہے، نہ گریسنگ کی ضرورت ہوتی ہے، نہ اور کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسا بے مثال نظام اللہ نے زبان کی شکل میں انسان کو عطا فرمایا ہے کہ انسان سوچتا رہے تو سوچتا رہ جائے گا، زندگی ختم ہوجائے گی؛ لیکن اس کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا، جس مالک نے اتنی عظیم الشان نعمت عطا فرمائی ہے، اُس کی قدردانی اور اس کی عظمت کا احساس ہم سب کے دلوں کے اندر ہونا چاہیے، یہ ہماری لازمی ذمہ داری اور فریضہ ہے۔

زبان کے صحیح استعمال نہ کرنے پر وعید

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مومن بندے کی نشانی اور علامت یہ ہے کہ جب وہ بولتا ہے تو صحیح بولتا ہے؛ ورنہ تو وہ سکوت و خاموشی کو اختیار کرتا ہے، قرآنِ پاک میں ارشاد فرمایا گیا: ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ (سورۂ ق:۱۸) دائیں بائیں بازوں پر اللہ کی طرف سے بٹھائے گئے فرشتے انسان کی زبان سے نکلنے والے ہر ہر بول کو لیتے رہتے ہیں، لکھتے رہتے ہیں، اچھائیوں کے لکھنے پر مامور فرشتہ اچھائیوں کو لکھتا ہے، برائیوں کے لکھنے پر مامور فرشتہ برائیوں کو لکھتا ہے، جو بول بھی انسان اپنی زبان سے بولتا ہے، اللہ کی طرف سے مقرر کردہ فرشتہ اسے محفوظ کرلیتا ہے کہ کب کتنے منٹ پر، کتنے سیکنڈ میں انسان کی زبان سے کیا جملہ نکلا، اور یہ سارا ریکارڈ تیار ہو رہا ہے، اور ایک دن وہ آئے گا اللہ کی جانب سے ہمارا کچا چٹھا سامنے پیش کردیا جائے گا۔ انسان کی زندگی کے منٹ منٹ کا حساب نکل کر سامنے آجائے گا، یہ احساس اگر انسان کی زندگی کے اندر ہو تو وہ زبان کے صحیح استعمال کی فکر بھی کرے، اور جب یہی احساس ختم ہوجائے تو اس کی فکر بھی دل سے نکل جاتی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہی ارشاد فرما رہے ہیں کہ ایمان کی نشانی اور علامت یہ ہے کہ یا تو بولو تو اچھا بولو؛ ورنہ سکوت و خاموشی اختیار کرلو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سب سے زیادہ جہنم میں

لوگوں کے جانے کا ذریعہ اور باعث یہ زبان ہوگی، ویسے تو گناہوں کی ایک لمبی فہرست ہے؛ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اکثر وبیشتر انسان جہنم کی آگ میں اسی زبان کے غلط استعمال کی وجہ سے جلے گا؛ کیوں کہ جھوٹ اسی زبان سے انسان بولتا ہے، غیبت اسی زبان سے کرتا ہے، چغلی اسی زبان سے کرتا ہے، لوگوں کو دھوکہ اسی زبان سے دیتا ہے، لوگوں کی عزتوں سے کھلواڑ انسان اسی زبان سے کرتا ہے، بہت سے گناہِ کبیرہ ہیں جن کا ارتکاب انسان اسی زبان سے کرتا ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لمعاذ بن جبلؓ ثکلتک أمک وهل یکب الناس علی مناخرهم في النار إلا حصائد ألسنتهم. (سنن ترمذی:٢٦١٦)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہاری ماں تمھیں روئے، اکثر وبیشتر لوگ جہنم میں منہ کے بل اپنی زبان کی کٹی ہوئی کھیتیوں کی وجہ سے جائیں گے، کھیتیوں کا مطلب زبان سے انسان جو بولتا ہے کٹی ہوئی کھیتیوں کی مثال ہے، اکثر وبیشتر اپنی زبان کے غلط استعمال کی وجہ سے اوندھے منھ جہنم میں ڈالے جائیں گے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **من صمت نجا** (جس نے خاموشی اختیار کر لی وہ نجات پا گیا)؛ اس لیے کہ جب آدمی زیادہ بولے گا تو زیادہ غلطیاں اس سے ہوں گی، اور کم سے کم بولے گا تو کم سے کم غلطیوں کا امکان ہوگا۔

زیادہ بولنے کے نقصانات

روي عن عمرؓ من کثر کلامه کثر سقطه قل حیاؤه ومن قل حیاؤه قل ورعه ومن قل ورعه مات قلبه. (سنن ترمذی ٢٤١٠)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جو زیادہ بولتا ہے اُس سے غلطیاں زیادہ ہوتی ہیں، حیا کم ہوجاتی ہے اور جس میں حیا کم ہوجاتی ہے اُس میں پرہیزگاری کم ہوجاتی ہے اور جس میں پرہیزگاری کم ہوجاتی ہے اُس کا دل مرجاتا ہے۔

حضرات علماء فرماتے ہیں: **لو کان الکلام من فضة فالسکوت من ذهب.** اگر بول چال کو چاندی کہا جائے، اگر گفتگو اور بات چیت کو چاندی کہا جائے تو سکوت وخاموشی اختیار کرنا سونا ہے، یعنی بولنے چالنے کے مقابلہ میں خاموش رہنا اعلیٰ درجہ کی چیز ہے، ضرورت کے بقدر انسان اپنی زبان کا استعمال کرے، بے

ضرورت اگر زبان کا استعمال ہوگا تو لامحالہ غلطیاں انسان سے ہوں گی، گناہوں کا صدور ہوگا اور اس کے نامۂ اعمال میں گناہوں کا اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

عن أنس بن مالکؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لايستقيم إيمان عبد حتى يستقيم قلبه ولايستقيم قلبه حتى يستقيم لسانه ولايدخل (الجنة رجل) لايأمن جاره بوائقه. (بيهقي في شعب الإيمان ٤١/١)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: انسان کا ایمان اس وقت تک درست نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کا دل درست نہ ہو اور انسان کا دل اُس وقت تک درست نہیں ہوسکتا جب تک اس کی زبان درست نہ ہو، اور کوئی شخص اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہوگا جب تک کہ اس کا پڑوسی اس کی اذیت سے محفوظ نہ ہو۔

حضرات علماء فرماتے ہیں کہ سب سے لمبی قید میں اگر کوئی چیز رہنے کے لائق ہے تو زبان ہے، زبان کے لیے قید کیا ہے؟ بے ضرورت گفتگو اور بات چیت سے اس کو روک دیا جائے، فضول گفتگو سے زبان کو روک دینا زبان کے لیے قید کا درجہ رکھنے والی ہے۔

عن النبي صلّى اللّٰه عليه وسلم إن الرجل ليتكلم بالكلمة لايرى أن تبلغ حيث بلغت يهوي بها في النار سبعين خريفا. (رواه احمد)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انسان کوئی کلمہ اپنی زبان سے ادا کرتا ہے اس کی کوئی پرواہ بھی نہیں کرتا اس کی وجہ سے جہنم میں ستر سال کی مسافت کے بقدر چلا یا جاتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **إن الله تعالىٰ يبغض البليغ من الرجال الذي يتخلل بلسانه تخلل الباقرة بلسانها.** (ابو داؤد باب الادب) اللہ تعالیٰ ایسے انسان اور چرب زبان لوگوں کو پسند نہیں کرتا ہے جو اپنی زبانیں اس طرح چلاتے ہیں جس طرح گائے اپنی زبان سے چارہ چباتی ہے۔

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک صاحب آئے جو بڑے چرب زبان تھے، بعض لوگوں کو بولنے پر بڑی قدرت ہوتی ہے اور ایسی اچھی بات کرتے ہیں کہ دوسرے کو متاثر کر دیتے ہیں چاہے وہ غلط بات کہہ رہے ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سمجھ گئے کہ چرب زبان ہیں اور زبان کے اثر سے متاثر کرنا چاہتے ہیں، آپ تو بھانپ جاتے تھے، جب وہ بات پوری کر چکے تو نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کسی انسان کو اللہ کی جانب سے چرب زبانی سے زیادہ بُری چیز نہیں دی گئی، یعنی زبان کے غلط استعمال سے زیادہ بری چیز انسان کے لیے کوئی دوسری نہیں، اسی زبان کو صحیح کاموں کے لیے اگر استعمال کرے گا تو نامۂ اعمال میں نیکیوں کا چٹہ لگ جائے گا، اور اسی کو اگر غلط کاموں کے لیے استعمال کیا جائے تو نامۂ اعمال میں گناہوں کا ڈھیر لگتا چلا جائے گا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشاداتِ گرامی کی روشنی میں ہمیں اپنی زندگی کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے، ہم جب اپنے دوستوں کے درمیان بیٹھتے ہیں تو کتنی ایسی باتیں ہماری زبانوں سے نکلتی ہیں۔ جن کا نہ دینی اعتبار سے کوئی نفع ہے، نہ دنیوی اعتبار سے کوئی فائدہ؛ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط بیانی نہیں ہوگی اکثر وبیشتر دنیوی اعتبار سے بھی ان کا نقصان اٹھانا پڑتا ہے اور اخروی اعتبار سے تو اٹھانا پڑے گا ہی۔ باری تعالیٰ ہم سب کو زبانوں کے صحیح استعمال کی توفیق مرحمت فرمائیں، آمین۔

❑❖❑

اصلاحِ معاشرہ

حُبِ رسول ضروری ہے

ازقلم: مولوی محمد عبداللہ مہاراشٹری

تعلق جب دوستی اور اخوت کی حد سے بڑھ کر سطح دل پر اثر انداز ہونے والا جذبہ بن جاتا ہے تو اسے محبت کا پاکیزہ نام دیا جاتا ہے، ربِّ کریم جل وعلیٰ نے ہر انسان کے دل میں محبت کا جو عنصر پیدا کیا اور اس جذبہ کو پرداخت دی اور اس احساس کو مرد وعورت میں مشترک رکھا، اس کا مصرف اور تقاضہ یہ ہے کہ انسان اپنے سینے میں صرف اور صرف اللہ اور اس کے رسول کی محبت کا شامیانہ لگائے اور اس کے لیے قنات کھینچے۔ خدا کی محبت تو اس لیے کہ وہی ہمارا خالق و مالک کارساز اور ماویٰ وملجا ہے، وہ ہر قسم کی محبت اور عظیم تر محبت کا سب سے زیادہ مستحق ہے کیوں کہ وہ اعلیٰ صفات کمال سے متصف ہے، جس کی کوئی انتہاء اور کوئی حد نہیں ہے۔ وہی ہے جو بندوں پر اپنے جود وسخا کے خزانوں سے نعمتیں برساتا ہے جس کا شمار نہیں ہوسکتا اور وہ احسانات کرتا ہے جس کا احاطہ نہیں ہوسکتا اور رسول کی محبت اس لیے کہ محبت کے جس قدر اسباب ممکن ہو سکتے تھے، تمام کے تمام اس کی ذاتِ مقدسہ میں موجود ہیں اور بدرجۂ اکمل واتم، نیز تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ محبت کے وہی مستحق ہیں اور نبی سے محبت ہمارے ایمان کا جزء ہے۔

اور محبت کی من جملہ علامات میں سے یہ ہے کہ تمام معاملات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی جائے، قرآن کریم سے محبت وتلاوت ہو، آپ کی احادیث پڑھی جائیں، آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور طریقہ پر عمل کیا جائے، آپ کی سیرت اور شمائل کو اپنایا جائے، آپ کا ذکر خیر کثرت سے کیا جائے، آپ درود شریف پڑھا جائے، آپ سے ملنے کا اشتیاق ہو، غرض کہ حب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کی تمام محبتوں میں بلکل منفرد ان سب سے ممتاز ہے اور ہاں! یہ کوئی حادثاتی محبت اور اتفاقی محبت نہیں کہ اچانک قائم کرلی جائے اور اچانک ختم کردی جائے یا پھر کبھی کرلی جائے اور کبھی نہ بھی کی جائے تو کوئی حرج نہیں؛ بلکہ رسول اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وہ چیز ہے جو دنیا وآخرت میں کامیابی کی ضامن ہے، خود نبی پاک حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”لَایُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی أَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَالِدِهٖ وَ وَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ“ اور اس محبت کا عملی نمونہ صحابۂ کرامؓ کی جماعت تھی۔

صحابۂ کرامؓ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے عینی شاہد اور گواہ، آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے آراستہ و پیراستہ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت وصحبت یافتہ اور آپ کے دین کو پہنچانے اور پھیلانے کا اولین ذریعہ اور وسیلہ تھے۔ صحابہ کرامؓ کی زندگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے معمور اور بھرپور تھی، اپنی جان و مال اور آل واولاد کی پرواہ کئے بغیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر حکم پر تعمیل کرنا ان کا خاصہ اور طرۂ امتیاز تھا۔ صحابہ کرامؓ نے آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی محبت کو اقوامِ عالم میں روشناس کرایا اور پھیلایا، جو آپ کے مکارمِ اخلاق اور جود وکرم کے ذریعہ ان کے اعمال واخلاق پر چھائی ہوئی تھی۔

امام بخاری علیہ الرحمہ نے حضرت عبداللہ بن ہشامؓ سے روایت نقل کی ہے کہ ایک دن ہم نبی کریم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمرؓ کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! بے شک آپ مجھے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں، سوائے میرے نفس کے۔ تو نبی کریم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایسا نہیں ’’قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، جب تک میں تمہارے نفس سے بھی زیادہ محبوب نہ ہوجاؤں، حضرت عمرؓ نے کہا: بے شک آپ مجھے میرے نفس سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ہاں! اب تمہارا ایمان مکمل ہوگیا، اے عمر۔

اس طرح کی بے شمار مثالیں ہیں۔ صحابہ کرامؓ کی زندگی رسول اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے بھری پڑی ہے؛ لہٰذا ہر مسلمان کو چاہیے کہ اپنے دل میں حب رسول کی شمع روشن کرے، محبتِ رسول کے جام کو پی جائے، شب وروز اسی کی محبت میں گذارے۔ حبِ رسول کی لازوال لذت سے آشنا ہوجائے، دن کا ہر لمحہ نبی کی یاد میں گذرے اور جب رات کو آنکھ لگے تو خواب میں دیدار ہوجائے۔ ؎

محمد کی محبت دینِ حق کی شرطِ اول ہے
اسی میں ہو اگر خامی تو سب کچھ نامکمل ہے

❑❖❑

اصلاحِ معاشرہ

توسل کی شرعی حیثیت

ازقلم: مفتی عبداللطیف صاحب قاسمی، استاذ مدرسہ عربیہ غیث الہدیٰ بنگلور

توسل کا مسئلہ ذوجہتین ہے، ایک طرف بدعتی حضرات وسیلے میں غلو کرتے ہوئے ہر قسم کی بدعات اور خرافات حتیٰ کہ شرک کے مرتکب ہوتے ہیں، دوسری طرف اصحابِ ظواہر (غیر مقلدین) وسیلے پر مطلقاً شرک کا حکم لگاتے ہوئے حدودِ شرعیہ سے تجاوز کر جاتے ہیں، مندرجہ ذیل سطور میں جواز وعدم کے اعتبار سے وسیلے کی شرعی حیثیت کو عرض کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

وسیلہ؛ وسل مصدر سے مشتق ہے جس کا معنیٰ ملنا اور جُڑنا ہے، یہ لفظ سین اور صاد دونوں سے تقریباً ایک ہی معنیٰ میں آتا ہے؛ البتہ وصل بالصاد مطلقاً ملنے اور جوڑنے کے معنیٰ میں ہے اور وَسْلٌ بالسین رغبت اور محبت کے ساتھ ملنے کے لیے مستعمل ہوتا ہے۔

اللہ کی طرف وسیلہ ہر وہ چیز ہے جو بندے کو رغبت و محبت کے ساتھ اپنے معبود کے قریب کردے؛ اِس لیے سلف صالحین، صحابہ وتابعین (عبداللہ بن عباسؓ، مجاہد، ابووائل، حسن بصری، قتادہ، عبداللہ بن کثیر، سدی اور ابنِ زید وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ) ائمہ مفسرین نے اِس آیت میں تفسیر طاعت، قربت اور ایمان واعمالِ صالحہ سے کی ہے۔

لفظ وسیلے کی لغوی تشریح اور صحابہ وتابعین کی تفسیر سے جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ ہر وہ چیز جو اللہ کی رضا وقربت کا ذریعہ بنے، وہ انسان کے وسیلے کے لیے اللہ تعالیٰ سے قریب ہونے کا وسیلہ ہے، اِس میں جس طرح ایمان واعمالِ صالحہ داخل ہیں، اِسی طرح انبیاء وصالحین کی صحبت ومحبت بھی داخل ہے کہ وہ بھی رضائے الٰہی کے اسباب میں سے ہے۔

(۱) وسیلے کی پہلی صورت:

حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم، حضراتِ انبیاء، صحابۂ کرام اور دیگر مقبولانِ الٰہی کے طفیل اور وسیلے سے دعاء مانگنا جائز ہے جس کی صورت یہ ہے:

''اے اللہ! اپنے نیک اور مقبول بندوں کے طفیل میری یہ دعا قبول فرما، فلاں مراد پوری فرما''۔

اِسی طرح کسی زندہ شخصیت کے وسیلے سے بھی دعا کرنا بھی جائز ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ صلاۃ

الاستقاء میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے وسیلے سے دعا کیا کرتے تھے۔ (رواہ البخاری:۱/۱۳۷)

عن أنس بن مالک رضي اللّٰہ عنہ أن عمر بن الخطاب رضي اللّٰہ عنہ کان إذا قحطوا، استسقی بالعباس بن عبدالمطلب، فقال: اللّٰھم إنا کنّا نتوسل إلیک بنبینا صلّی اللّٰہ علیہ وسلم فتسقینا، وإنا نتوسل بعم نبینا صلّی اللّٰہ علیہ وسلم، فاسقنا، قال: فیسقون. (رواہ البخاری، ابواب الاستقاء:۱/۱۳۷)

نیز اپنے کسی نیک عمل کا حوالہ و وسیلہ دے کر دعاء کرنا بھی جائز ہے جیسا کہ حدیثِ غار میں صراحت ہے۔

(بخاری، باب: إذا اشتری شیئًا لغیرہ:۱/۲۹۳، ۲۲۱۵)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو خود اپنے وسیلے سے دعاء کرنے کی تلقین فرمائی۔

عن عثمان بن حنیف رضي اللّٰہ عنہ أن رجلًا أتی النبي صلّی اللّٰہ علیہ وسلم فقال: أدع اللّٰہ أن یعافیني، فقل: إن شئت أخرت ذٰلک، وھو خیر لک، وإن شئت دعوت، قال: فادعہ، قال: فأمرہ أن یتوضأ، ویحسن وضوءہ، ویصلي رکعتین، ویدعوا بھٰذا الدعاء فیقول: اللّٰھم إني أسئلک، وأتوجہ إلیک بنبیک محمد نبي الرحمۃ، یامحمد! إني أتوجہ بک إلٰی ربي في حاجتي ھٰذہ، فتقضي لي، اللّٰھم شفعہ، وشفعني فیہ. (اخرجہ الحاکم فی المستدرک:۱/۴۸، رقم:۱۱۸۰، **قال ھٰذا حدیث صحیح علٰی شرط الشیخین، ولم یخرجاہ وقال الذھبي في التلخیص علٰی شرطھما، واخرجہ الترمذي في دعاء المریض: ۲/۱۹۸**)

ایک نابینا شخص آپ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے نبی! دعا فرمایئے کہ اللہ مجھے عافیت (بینائی) عطا فرمادے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر تم چاہو تو میں تمہارے لیے دعا کو مؤخر کردوں (بجائے دنیاوی ضرورت کے آخرت سے متعلق دعاء کروں) یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا، اگر تم چاہو میں تمہارے لیے (دنیا ہی میں بینائی ملنے کی) دعا کروں، اس شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ! دعا فرمادیجیے، اِس صورت کے جائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ توسل میں دعاء بزرگوں سے نہیں کی جاتی؛ بلکہ براہِ راست اللہ تعالیٰ سے کی جاتی ہے، پس جب کسی مقبول بندہ کے توسل سے دعاء کرنا جائز ہے جو اس دنیا میں موجود ہو تو ان مقبولانِ الٰہی کے توسل سے دعاء کرنا بھی صحیح ہوگا جو اِس دنیا سے رحلت فرماگئے۔

نیز اپنے کسی نیک عمل کے توسل سے دعا کرنا جائز ہے، تو کسی مقبولِ خدا کے توسل سے دعا کرنا بھی صحیح ہے؛

کیوں کہ اِس کی حقیقت دراصل یہ دعا کرنا ہے کہ اے اللہ! میرا تو کوئی عمل ایسا نہیں ہے جس کو میں آپ کی بارگاہ میں پیش کر کے اُس کے وسیلے سے دعاء کروں؛ البتہ فلاں بندہ آپ کی بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہے اور مجھے اس سے محبت اور عقیدت کا تعلق ہے، پس آپ اس تعلق کی لاج رکھتے ہوئے جو مجھے آپ کے نیک بندوں سے ہے، میری دعا قبل فرما۔ بہر حال توسل کی مذکورہ بالا صورت صحیح ہے اور بزرگانِ دین سے منقول اور ان کا معمول رہا ہے؛ مگر یہ عقیدہ نہ رکھا جائے کہ توسل کے بغیر جو دعا کی جائے وہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں مقبول نہیں ہوگی، نہ یہ عقید ہ رکھا جائے کہ حضراتِ انبیاء وصلحاء کے وسیلے سے جو دعا کی جائے اُس کا مقبول ہونا لازم اور ضروری ہے؛ بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ ان مقبولانِ الٰہی کے وسیلے سے جو دعا کی جائے گی اُس کی مقبولیت کی زیادہ اُمید ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے قبول ہوئی، اِس روایت کو امام حاکم، طبرانی، بیہقی اور ابونعیم وغیرہ محدثین رحمہم اللہ نے اپنی کتبِ حدیث میں تخریج کی ہے اور حاکم نے مستدرک علی الصحیحین میں شیخین کی شرط پر اِس کو صحیح قرار دیا ہے؛ لیکن محدثین نے حاکم کے اس فیصلے پر اعتراض کیا ہے، حافظ ذہبیؒ نے ''التلخیص الحبیر'' میں موضوع قرار دیا ہے؛ نیز ملا علی قاریؒ نے ''الموضوعات الکبریٰ'' میں اِس کو موضوع قرار دیا ہے؛ البتہ اس کے معنیٰ کی تصحیح کی ہے؛ لہٰذا یہ روایت جمہور محدثین کے نزدیک انتہائی ضعیف ہے؛ البتہ تائید کے لیے پیش کی جاسکتی ہے۔

عن عبدالرحمٰن بن زید بن أسلم، عن أبیه عن جده عن عمر بن الخطاب رضي اللّٰه عنه قال، قال رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلم: لمّا اقترف آدم الخطيئة قال: يارب! أسئلک بحق محمد لما غفرت لي، فقال اللّٰه عزّ وجلّ ياآدم! كيف عرفت محمدا ولم أخلقه؟ قال: لأنک يارب لما خلقتني بيدک، ونفخت فيَّ من روحک، رفعت رأسي، فرأيت علٰى قوائم العرش مكتوبًا ''لاإلٰه إلّا اللّٰه، محمد رسول اللّٰه'' فعلمت أنک لم تضف إلٰى اسمک إلا أحب الخلق إليک، فقال اللّٰه عزوجل: صدقت ياآدم! إنه لأحب الخلق إلي، وإذا سألتني بحقه، فقد غفرت لک، ولولا محمدا ماخلقتک، هٰذا حديث صحيح الإسناد.

(المستدرک على الصحيحين: ۹۷۲/۲، ۴۲۲۸، قال الذهبي في التلخيص الحبير بل موضوع، واخرجه الطبراني في المعجم الأوسط، والمعجم الصغير، التعليق على المستدرک: ۹۷۲/۲)

قال علي القاري في ”الموضوعات الكبرىٰ“ موضوع لكن معناه صحيح.

(تحقیق المقال فی تخریج احادیث فضائلِ اعمال: ۶۲۰)

حضرت مولانا عبدالحئی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

سلف صالحین کا قرونِ ثلاثہ میں یہی دستور رہے کہ جو حضرات اپنے زمانے میں صلحاء اور اولیاء اللہ معلوم ہوئے، لوگ اپنی قبولیت دعا کے واسطے ان کو تکلیف دیتے رہے اور ان سے دعا کرنے کی خواست گاری کرتے رہے، بناءً علیہ اگر اب بھی کوئی صالح ولی اللہ معلوم ہو، تو لوگ ان سے دعا کرائیں یا اُن سے اپنی قبولیتِ دعا میں وسیلہ ٹھہرائیں، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو لوگوں نے پیشوا کر کے اپنی طلبِ حاجت کی تھی، بالاتفاق جائز ہوگا اور اس میں فقہائے حنفیہ کا اختلاف نہیں ہے۔

بعدِ وصال یعنی وفات کے بعد ان سے دعا کرانا یا اپنی حاجت روائی کے واسطے کسی طرح تکلیف دینے کا دستور قرونِ ثلاثہ مشہود لہا بالخیر (وہ تین زمانے جن کے سراپا خیر ہونے کی شہادت دی گئی ہے) اور زمانۂ مجتہدین میں نہیں پایا گیا، اس بنیاد پر فقہائے حنفیہ اس میں مختلف ہے، اکثر عدمِ جواز کے قائل ہیں، واضح رہے کہ یہی مذہب اکثر فقہاء کا قابلِ فتویٰ ہمارے زمانہ کے لیے ہے؛ کیوں کہ اِس میں احتیاط ہے۔

(مجموعۃ الفتاویٰ مولانا عبدالحئی فرنگی محلی بحوالہ شریعت یا جہالت: ۴۵۹)

حضرت مولانا پالن حقانی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

”کسی مزار پر جا کر یا اپنے گھر ہی میں سے اُن کے حق میں بعد فاتحہ یا دعائے مسنونہ یا خانہ کعبہ، یا مسجد، یا دیگر مقاماتِ مقدسہ، یا تلاوتِ قرآن کی برکت سے، یا فلاں زندہ بزرگ کے اعمالِ صالحہ کی برکت سے دعا کرے، اے باری تعالیٰ! میرا فلاں کام پورا کر دے، تو یہ جائز ہے؛ کیوں کہ سوال میں خطاب خدا سے ہے اور ان سب کا ذکر برکت کے واسطے کیا گیا، وسیلے کا درجہ صرف اتنا ہے کہ اس طرح سے دعا مانگی جائے جو طریقہ اُوپر بتایا گیا، تو اِس میں کوئی حرج نہیں، یہ اتنا سا درجہ وہ رنگ لایا کہ دنیا میں شرک وکفر اور بدعت کے جتنے بھی راستے کھلے ہیں وہ قریب قریب وسیلے کے بہانے سے کھلے ہیں؛ حالاں کہ دعا کے وقت کسی قسم کے واسطے یا وسیلے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی شرعِ شریف میں اِس کا کوئی حکم ہے اور نہ خدا کو اس کی ضرورت ہے؛ کیوں کہ وہ ہر وقت بغیر وسیلہ سنتا اور دیکھتا ہے؛ لیکن اگر ایسا کیا گیا تو حرج بھی نہیں ہے“۔

(شریعت یا جہالت: ۴۷۱-۴۷۲)

وسیلے کی دوسری صورت:

بعض لوگ وسیلے کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ چوں کہ ہماری رسائی خدائے تعالیٰ کے دربار تک نہیں ہو سکتی؛ اِس لیے ہمیں جو درخواست کرنی ہو اُس کے مقبول بندوں کے سامنے پیش کریں اور جو کچھ مانگنا ہو اُن سے مانگیں؛ چناں چہ یہ لوگ اپنی مرادیں اولیاء اللہ سے مانگتے ہیں اور اُن کا عقیدہ وخیال ہوتا ہے کہ یہ اکابر باعطائے الٰہی ان کی مرادیں پوری کرنے پر قادر ہیں، یہ فعل خالصۃً جہالت پر مبنی ہے جیسا کہ کفارِ مکہ کہا کرتے تھے: ﴿وَمَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ (زمر:۳) بعض بدعتی حضرات کا سورۂ مائدہ کی آیت ﴿وَابْتَغُوْآ اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ﴾ سے مرادیں اور اپنی حاجتوں کی تکمیل میں اولیاء اللہ سے استعانت اور مدد طلبی اور ان کے توسل کے ضروری ہونے پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے جیسا کہ شروع میں وسیلے کا لغوی وشرعی معنیٰ جمہور مفسرین سے نقل کیا گیا ہے، ان میں سے کسی نے اس معنیٰ پر استدلال نہیں کیا ہے، ان حضرات کی دوسری دلیل سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ﴾ (بنی اسرائیل:۵۷) ہے۔

اِس آیت کو سمجھنے کے لیے پہلے یہ آیت ملاحظہ فرمائیں:

﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ، فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ○ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ﴾ (بنی اسرائیل:۵۶-۵۷)

اِس آیت کا سیاق اور خود نفسِ کلام گواہی دے رہا ہے کہ حضراتِ انبیاء علیہم السلام، اولیاء اللہ، فرشتے یا کسی کی بھی یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ تمہاری مدد کر سکیں، تم حاجت روائی کے لیے اُن کو وسیلہ بنا رہے ہو؛ حالاں کہ وہ خود اللہ کی رحمت کے اُمیدوار ہیں اور اللہ تعالیٰ کا زیادہ سے زیادہ تقرب حاصل کرنے کے لیے وسیلہ (ایمان وعملِ صالحہ) ڈھونڈ رہے ہیں، جن کا یہ حال ہو کیا وہ تمہاری حاجت روائی کر سکتے ہیں؟

یہ دراصل دو غلطیوں کا مجموعہ ہے:

(۱) لوگوں نے خدائے تعالیٰ کے دربار کو دنیا کا شاہی اور سیاسی دربار سمجھا ہے کہ ان تک رسائی ہر کس وناکس کی ممکن نہیں، نہ اُن تک اپنی بات پہنچانا آسان ہے، اِسی طرح خدائی دربار ہے؛ حالاں کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کی بات سنتے ہیں۔

﴿اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ﴾ (البقرہ:۱۸۶)

(۲) دوسری غلطی: جس طرح دنیا کے اُمراء کے یہاں عہدے اور منصب ہوتے ہیں اِسی طرح اللہ تعالیٰ

نے عہدے اور اختیارات اولیاء اللہ میں تقسیم فرما رکھے ہیں، یہ عقیدہ رکھنا، اِس طرح سے وسیلہ پکڑنا جائز نہیں ہے؛ بلکہ سراسر بدعت، جہالت اور شرک ہے۔

حضرت مولانا پالن حقانی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

وہ مطلب جو جیب بھرو پیر اور پیٹ بھرو مولوی اور ان کے چیلے بیان کرتے پھرتے ہیں یعنی اولیاء اللہ رحمۃ اللہ علیہم سے مانگنا اور ہر کام میں اُن سے استمداد کرنا اور مثال دیا کرتے ہیں کہ اگر بادشاہ سے کچھ لینا ہے تو پہلے اُس کے مصاحبین اور حکام کے پاس جانا ہوگا، تب ہی کام بنے گا، اِسی طرح خدا کا معاملہ بھی ہے، تو یہ بات انتہائی گمراہ کن اور شرعِ اسلام کے بالکل خلاف ہے۔ (شریعت یا جہالت:۴۶۱)

وسیلے کا ایک معنیٰ تو وہی ہے جو آیتِ وسیلہ میں حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہؒ سے منقول ہے اور ایک وسیلہ وہ ہے جو اذان کے بعد پڑھی جانے والی دعا میں ہے، اِس سے مراد جنت میں ایک اعلیٰ درجہ ہے، جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخصوص ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جس نے اذان سننے کے بعد یہ دعا مانگی:

اللّٰھم ربّ ھٰذہ الدعوةِ التامّة والصلاة القائمة آت محمد ن الوسيلة والفضيلة وابعثه مقامًا محمود ن الذي وعدته.

”اے اللہ! اِس پکار اور قائم رہنے والی نماز کے مالک! محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو وسیلہ اور فضیلت عطا کر اور مقامِ محمود میں بھیج، جس کا تُو نے وعدہ کیا) جس نے یہ دعا مانگی اُس کے لیے میری شفاعت واجب ہوگئی“۔ (ترمذی)

اِس حدیث میں اذان کی دعا میں جو وسیلے کا لفظ ہے اُس سے بھی کسی نبی علیہ السلام، یا ولیؒ کا وسیلہ مراد نہیں ہے؛ بلکہ اس وسیلے سے مراد یا تو جنت کا وہ مقام ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لیے خاص ہے یا تو پھر اس جگہ کا نام ہے جہاں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوکر تمام امتیوں کی شفاعت کریں گے۔

طبرانی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ تم اللہ سے دعا کرو کہ خدا مجھے وسیلہ عطا فرما، جو شخص میرے لیے دنیا میں دعا کرے گا میں اُس پر گواہ یا سفارشی قیامت کے دن بن جاؤں گا اور حدیث میں ہے: وسیلے سے برا کوئی درجہ جنت میں نہیں ہے۔ (تفسیر ابنِ کثیر)

آیتِ شریفہ کا صحیح مطلب:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو، یعنی گناہ کے کام نہ کیا کرو اور وسیلہ ڈھونڈ و اللہ

کی طرف، یعنی پسندیدہ اور نیک اعمال سے اور معصیتوں کو ترک کرنے سے خدا کا قرب اور نزدیکی طلب کرو، یہ بات اِس لیے کہی جارہی ہے کہ جب پہلے فرمایا کہ اللہ سے ڈرتے رہو تو اب یہ بتایا جارہا ہے کہ اللہ سے ڈرنا ایسا نہیں جیسا سانپ، بچھو، شیر، بھیڑیے سے ڈر کر دُور بھاگتا ہے؛ بلکہ خدا سے ڈرنا ایسا ہونا چاہیے کہ اُس کی ناخوشی سے ڈر کر اُس کا قرب اور وصل حاصل کرنے کی کوشش ہو، خوف اور ڈر کی پہلی صورت نفرت کی وجہ سے ہوتی ہے اور یہ دوسری صورت محبت کی وجہ سے ہوتی ہے؛ اِسی لیے جب ڈرنے والی بات پہلے کہی گئی تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے قرب طلب کرنے کا حکم ہوا اور اللہ تعالیٰ کا قرب پسندیدہ عمل ہی سے ہوسکتا ہے، اس کے بعد اس آیتِ شریفہ میں تیسرا حکم ہے کہ اللہ کے راستے میں جہاد کرو، یعنی وہ قوتیں جو تمہیں خدا کے راستے سے ہٹا دینے والی ہوں اُن کا ڈٹ کر مقابلہ کرو، وہ چاہے کفار اور مشرکین ہوں یا تمہارا اپنا نفس ہو یا شیطان ہو۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: خدا کی اطاعت اور اس کی مرضی کے اعمال سے اس سے قریب ہوتے جاؤ، ان ائمہ نے وسیلے کا جو مطلب اِس آیت سے لیا ہے اِس پر سب مفسرین کا اتفاق ہے، اِس میں کسی ایک کا بھی اختلاف نہیں ہے، امام ابنِ جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اِس پر ایک عربی شعر بھی کہا ہے، جس میں وسیلے کا مطلب قربت اور نزدیکی کو لیا ہے۔

تفسیر ابنِ کثیر میں ہے: جو سچے اور پکے ایمان والے ہیں اُن سے اللہ کا سودا ہو چکا ہے، اللہ تعالیٰ نے جنت کے بدلے میں مؤمنوں کی جانیں اور ان کے مال خرید لیے ہیں، یہی ہے صحیح وسیلہ، جہالت کی وجہ سے یا بے خبری سے یا بھولے سے یا رسمی طور پر جو لوگ درگاہوں پر یا خانقاہوں پر یا تعزیتوں پر جاتے ہیں اور وہاں پر نیاز ونذر کرتے ہیں اور جاہل مجاور بعض جگہ پر تو سجدے کرواتے ہیں اور جاہل، اَن پڑھ اور بھولے لوگوں کو سمجھاتے ہیں کہ قیامت کے دن یہ تمہاری سفارش کریں گے یا تمہاری نجات کے لیے وسیلہ بنیں گے یا تمہیں اللہ کے قریب کریں گے، یہی عقیدہ مشرکانِ مکہ کا تھا، اِسی عقیدے نے لوگوں کو گمراہ کیا اور اسی عقیدے کی بنا پر بُت پرستی پھیلتی چلی گئی اور آج اسی عقیدہ پر قبریں پوجی جارہی ہیں اور اسی عقیدے پر چرچ اور گرجے بنائے جارہے ہیں اور اسی عقیدے پر دیو، دیویاں پوجی جارہی ہیں اور اسی عقیدے پر مزاروں پر نیاز ونذر چڑھائی جارہی ہیں، اسی عقیدے نے اگلے لوگوں کو بھی تباہ وبرباد کیا اور آج اِسی عقیدے پر لوگ تباہ وبرباد ہورہے ہیں۔

(شریعت یا جہالت: ۴۶۶)

وسیلے کی تیسری صورت:

یہ ہوسکتا ہے کہ براہِ راست اولیاء اللہ سے اپنی حاجتیں طلب نہ کی جائیں؛ البتہ ان سے یہ درخواست کی

جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں ہماری حاجت ومراد پوری ہونے کے لیے دعا فرمائیں، اِس صورت کا حکم یہ ہے کہ اگر زندوں سے یہ درخواست کی جائے تو جائز ہے جیسا کہ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ سلم سے دنیاوی اور اُخروی ضروریات کی تکمیل کے لیے درخواست کرتے تھے اور خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ عمرہ کے لیے روانہ ہو رہے تھے تو ارشاد فرمایا:

أشركنا ياأخي في دعائك ولاتنسانا. (مشکاۃ، کتاب الدعوات:۱۹۵)

نیز عہدِ نبوت سے آج تک یہ سلسلہ معمول بہا ہے، اگر مُردوں سے اولیاء وصلحاء کی قبروں پر یہ درخواست کی جائے، تو یہ صورت جائز نہیں ہے؛ بلکہ بدعت وشرک ہے۔ (شریعت یا جہالت:۴۷۱-۴۷۲) واللہ اعلم بالصواب

❑❖❑

اصلاحِ معاشرہ (قسط اوّل)

قلب کو اخلاقِ محمودہ سے مزین کرنے کا بیان

ازقلم: مفتی محمد سلطان خان قاسمی، امام وخطیب مسجد ابوبکر صدیق، ڈی جے ہلی، بنگلور

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں وبیاں ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے احکامات اور اپنا دینِ متین انسانوں تک پہنچانے کے لیے انسانوں ہی کا انتخاب فرمایا؛ چنانچہ تمام انبیاءِ کرام علیہم السلام وتمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تمام تابعین وتبع تابعین اور اولیاءِ عظام رحمہم اللہ نے پوری امانت داری اور دیانت داری کے ساتھ اس دینِ متین کو امت تک پہنچایا، بریں بنا یہ تمام مبارک اور سعادت مند حضرات دنیا سے رخصت فرمانے کے بعد آج بھی زندہ وجادیں ہیں، ان ہی چنیدہ اشخاص میں سے حجۃ الاسلام حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ اقدس ہے، یہی وجہ ہے کہ آج بھی حجۃ الاسلام حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی لکھی گئی ہر چھوٹی اور بڑی تحریر میں وہ روحانیت موجود ہے جن سے علماءِ کرام اور خطباءِ عظام مستفید ہوسکتے ہیں اور ہورہے ہیں اور آج بھی وہ حلاوت وچاشنی کارفرما ہے جس سے تصوف وسلوک طے کرنے والے سالکین فیضیاب ہوسکتے ہیں اور ہورہے ہیں؛ بلکہ امت کا ہر طبقہ ان تحریرات اور مضامین سے استفادہ کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔

ان ہی مضامین میں سے چند چنیدہ مضامین قارئینِ کرام کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں؛ چونکہ انسان کے جسم میں اصل چیز اُس کا دل ہے؛ لہٰذا دل کو اخلاقِ حمیدہ سے آراستہ وپیراستہ کرنے کا طریقہ بیان کیا جائے گا، اس کے لیے ضروری ہے کہ قلب کو دس خوبیوں سے آراستہ کیا جائے۔

پہلی خوبی اور اصل توبہ ہے

''توبہ'' کے معنیٰ رجوع کرنے اور بعید سے قریب کی طرف لوٹ آنے کے ہیں۔

توبہ کی ابتداء اور انتہاء

توبہ کی ابتداء یہ ہے کہ دل کو اس مضمون کی پوری گہرائی حاصل ہوجائے کہ گناہ سمِ قاتل ہے اور تباہ کرنے والی شئی ہے اور توبہ کا درمیانی درجہ یہ ہے کہ انسان جس گناہ میں مبتلا تھا اُس کو فوراً چھوڑ دے اور توبہ کا انتہائی درجہ یہ

ہے کہ آئندہ کے لیے اس گناہ سے بچنے اور پرہیز کرنے کا مصمم ارادہ کرے اور اس کے ساتھ ہی جہاں تک ہو سکے گزشتہ تقصیر وکوتاہیوں کا تدارک کرے۔

توبہ کے معنیٰ اور حقیقت سمجھنے کے بعد جان لیں کہ توبہ کرنا ہر شخص پر واجب ہے؛ کیونکہ حق تعالیٰ شانہٗ نے قرآنِ کریم میں کئی جگہوں پر تمام ایمان والوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ: ''تم سب کے سب اللہ تعالیٰ سے توبہ کرو اور اللہ کی طرف لوٹ آؤ''۔ (تبلیغ دین: ص/۱۵۹، ترجمہ از منہاج العابدین)

اور حدیثِ مبارکہ میں یہی حکم واضح ہوتا ہے، روایت ملاحظہ فرمائیں: ''**عن أنس رضي الله عنه قال، قال رسول اللّٰه صلّى الله عليه وسلم: كلّ بني آدم خطّاء وخير الخطّائين التوّابون**''. (رواه الترمذي وابن ماجة، دالدارمي، مشكاة: ص/٢٠٤، حديث نمبر: ٢٣٤١) حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر آدم کا بیٹا گنہگار ہے اور بہترین گنہگار وہ ہیں جو اپنے گناہوں سے توبہ واستغفار کرنے والے ہیں۔

اِس حدیثِ مبارکہ سے یہ بات تو اچھی طرح واضح ہوتی ہے کہ ہر ایک انسان کو اللہ کی طرف رجوع کرنا ہے اور ہر شخص کو اپنے گناہوں سے توبہ واستغفار کرنا چاہیے؛ کیونکہ کوئی فردِ بشر گناہوں سے پاک نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بھول چوک اور خطاء ونسیان کا مادہ ہر انسان کے خمیر میں داخل فرمایا ہے اور خطا ونسیان ہی انسان کی پہچان ہے، جیسے عربی مقولہ ہے: ''**الإنسان مركّب من الخطاء والنسين**''. شاعر کہتا ہے:

نہ ہو کبھی کوئی غلطی اُسے فرشتہ کہتے ہیں
جو غلطی کر کے نادم ہو اُسے انسان کہتے ہیں
جو غلطی پہ غلطی کرے اُسے حیوان کہتے ہیں
جو غلطی کر کے اِترائے اُسے شیطان کہتے ہیں

اسی مضمون کو حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے یوں سمجھایا ہے: تمام بنی آدم اور ہر فردِ بشر پر توبہ کا وجوب اِس لیے ہے کہ آدمی چار قسم کے صفات سے مرکب ہے؛ کیونکہ اس کے خمیر میں **اوّل**: حرص، شہوت اور فسق وفجور داخل ہے جو بہائم کی صفت ہے۔ **دوم**: غصہ، حسد اور بغض وعداوت کا وہ مادہ اس کے اندر موجود ہے جو درندوں کی خاصیت ہے۔ **سوم**: مکر وفریب اور دھوکہ دہی ومکاری اس میں رکھی ہوئی ہے جو شیطانی صفت ہے۔ **چہارم**: کبر ونخوت وتعلّی وتفاخر، حُبِّ مدح، حکمرانی وسلطنت، حکومت وشان وشوکت اور غلبہ وعزت کی طلب کا مادہ اُس میں موجود ہے اور یہ سب ربوبیت کی صفات ہیں۔

ان خصائل کا غلبہ کب ہوتا ہے؟

ان چاروں خصائل کا اپنے اپنے وقت پر غلبہ اور اثر ظاہر ہوا کرتا ہے؛ چنانچہ سب سے پہلے زمانہ طفولیت میں تو بہائم اور حیوانات کی خصلتیں غلبہ کیا کرتی ہیں۔

اور انسان شہوت وحرص میں گویا چوپایا اور جانور بن جاتا ہے، اس کے بعد جب جوانی کا زمانہ آتا ہے تو درندوں کی عادتوں کا غلبہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے پر حسد کرتا ہے، باہم عداوتیں پیدا ہوتی ہیں، کسی سے بغض ہے، کسی سے دعناد، کسی پر غصہ آتا ہے، کسی کو ذرا سی طبیعت کے خلاف بات پر پھاڑ کھاتا ہے اور آپے سے باہر ہوا جاتا ہے، چیختا چلاتا ہے اور ڈروکتا ہے، کسی کو نعمت اور خوش حالی میں دیکھتا ہے تو جلتا کلستا اور چھیننے جھپٹنے کی فکر میں طیش کھایا کرتا ہے، غرض اس حالت میں وہ اور درندہ ہم جنس بن جاتے ہیں، پھر جب اس کے بعد عالمِ شباب کا شباب ہوتا ہے اور بدن میں قوت آتی ہے تو یہ بہائم ودرندوں کی خصلتیں چاہتی ہیں کہ اپنی خواہشیں پوری کریں یعنی مرغوب وپسندیدہ شیٔ کو حاصل کریں اور دشمن وناپسندیدہ امر کو زیر خاک کردیں، پس اس وقت شیطانی اخلاق ظاہر ہوتے اور اپنا غلبہ کرتے ہیں کہ ابھی کسی شیٔ کی خواہش پوری ہوئی اور فریب ودھوکہ بازی نے مدد کرنے کا اقرار کیا، ابھی کسی دشمن پر غصہ آیا اور فوراً مکاری وجعل سازی نے اپنی دانائی وہوشیاری کو پیش کیا، غرض اخلاقِ شیطانیہ اس زمانہ میں خصائلِ بہیمیہ اور عاداتِ سبعیہ کے نفاذ میں معین ومددگار بنتے اور انسان کو شیطان مجسم بنادیتے ہیں اور جب اس میں کامیابی وظفر اور اپنی حسبِ منشاء کارروائیوں میں فتح نظر آنے لگتی ہے تو پھر آخر میں تکبر وتعلّی پیدا ہوجاتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ہر شخص اس کی مدد کرے، ہر شخص اس کا مطیع وفرماں بردار ہوجائے، ہر شخص اس کی لڑائی وکمال کا معترف ہو، ہر شخص اس کو عقلمند اور واجب التعظیم سمجھے، غرض ایسی فرعونیت ذہن میں سماتی ہے کہ "ہم چو ما دیگرے نیست" کا پتلا بن جاتا ہے اور جب ان چاروں خصلتوں کا ظہور ہوتا ہے تو اب عقل کی قندیل اپنا منھ دکھاتی ہے، جس میں ایمان کا چراغ روشن ہوتا ہے اور اُس کو بھلے بُرے میں امتیاز کا موقع دیتا ہے، اگر یہ روشنی ظاہر نہ ہوتو خصائلِ مذکورہ کی ظلمت وتاریکی سے نجات ملنی دشوار ہوجاتی ہے۔ (تبلیغ دین: ۱۶۰، ترجمہ از منہاج العابدین)

کوئی انسان کسی وقت بھی گناہ سے خالی نہیں

کوئی انسان کسی وقت بھی گناہ سے خالی نہیں ہے؛ اِس لیے کوئی وقت بھی ایسا نہ ہوگا جس میں کوئی شخص توبہ سے مستغنی ہو؛ کیونکہ انسان کسی حال اور کسی مرتبہ کا بھی ہو یہ ضروری ہے کہ: (۱) یا تو اُس کے اعضاء میں سے کوئی

عضو کسی گناہ کا مرتکب ہورہا ہوگا (۲) یا قلب سے کوئی گناہ ثابت ہورہا ہوگا، یعنی یا تو اعضاء وجوارح کسی خلافِ شرع حالت میں ملوث ہوں گے یا قلب کسی مذموم خصلت یا ایسی بدعات میں ضرور مبتلا ہوگا کہ جس کی اصلاح کے لیے توبہ کی حاجت ہوگی اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ کوئی انسان فرشتہ سیرت اور ایسا مہذب بن گیا کہ اس کی کوئی عادت اور کوئی خصلت بھی ایسی نہیں ہے جس کی اصلاح کی ضرورت ہو، تب بھی کوئی وقت ایسا ضرورت ہوگا جس میں وہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہوجائے۔ (تبلیغ دین: ۱۶۱، ترجمہ منہاج العابدین)

اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے "كلّ بني آدم الخ" والی روایت میں اسی غفلت اور خطاء کا لحاظ رکھتے ہوئے ہر فردِ بشر کو توبہ واستغفار کی ترغیب دی ہے؛ نیز خود جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل کے ذریعہ لوگوں کو ترغیب دی ہے اور بتایا ہے کہ اللہ کی ذاتِ اقدس وہ اتنی بالاتر ہے کہ فخر الرسل سیّد الانبیاء تاجدارِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی جب روزانہ سو سو مرتبہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے توبہ واستغفار کی ضرورت ہے اور جب آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم خود کو قصوروار ٹھہرا کر اپنے کو توبہ کا محتاج سمجھتے ہیں اور پوری پوری رات توبہ واستغفار میں گزارا ہو تو ہم جیسے گناہ گاروں، خطا کاروں کو کتنا توبہ واستغفار کرنا چاہیے ظاہر ہے۔

روایت پیشِ خدمت ہے: **عن أبي هريرة رضي الله عنه قال، قال رسول الله صلّى الله عليه وسلم: إني لأستغفر الله وأتوب إليه في مأة مرة.** (رواه ابن ماجة: ص/ ۲۷۰ باب الاستغفار)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: میں تو اللہ تبارک وتعالیٰ سے سو سو مرتبہ توبہ واستغفار کرتا ہوں۔

اِس حدیثِ مبارکہ سے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ظاہر ہورہا ہے اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات جہاں اخلاق وعبادت وغیرہ میں ہمارے لیے نمونہ ہے، وہیں توبہ واستغفار میں بھی ہمارے لیے نمونہ ہے؛ لہٰذا ہم میں کا ہر ایک چاہے وہ کتنا ہی بڑا اللہ والا کیوں نہ ہو، وہ توبہ واستغفار کا محتاج ہے۔

توبہ کرنے والوں کے لیے خوش خبری

اور جو شخص حق تعالیٰ شانہٗ کی بارگاہِ اقدس میں توبہ کرے اور اپنے گناہوں سے نادم ہوکر اللہ تعالیٰ شانہٗ کی طرف لوٹ آئے تو ایسے شخص کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنا محبوب بنانے کا وعدہ کیا ہے؛ چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ: جب بندہ اپنے گناہوں سے بیزار اور نادم ہوکر اللہ تعالیٰ کی جانب رجوع کرتا ہے اور اپنے گناہوں سے توبہ کرتا ہے تو اللہ پاک اس کو اپنا محبوب بنا لیتے ہیں۔ حدیثِ مبارکہ ملاحظہ فرمائیں: **عن علي**

رضي اللّٰه عنه قال، قال رسول الله صلّى الله عليه وسلم: إن الله يحب المؤمن المفتن التوّاب. (مشكاة: ص/٢٠٦، حديث:٢٣٥٩) حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے،فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اس بندۂ مؤمن کو اپنا محبوب بنالیتے ہیں جو اپنے گناہوں کے بوجھ سے بے چین اور مضطرب ہوکر اللہ تبارک وتعالیٰ سے خوب توبہ واستغفار کرتا ہے۔

اِس روایتِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ اللہ کا محبوب بننے کے لیے اپنے گناہوں سے توبہ کرنا ہرفردِ بشر کے لیے ضروری ہے۔

دوسری روایت سے یہ خوش خبری بھی معلوم ہوتی ہے کہ بندہ اپنے گناہوں سے توبہ کرتا ہے تو وہ اللہ کے نزدیک ایسا ہوجاتا ہے گویا اُس نےگناہ کیا ہی نہیں۔

عن عبدالله بن مسعود رضي الله عنه قال، قال رسول الله صلّى الله عليه وسلم: التائب من الذنب كمن لا ذنب له.

(رواه ابن ماجة، والبيهقي في شعب الإيمان، مشكاة: ص/٢٠٦، حديث:٢٣٦٣)

’’حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گناہوں سے توبہ کرنے والا ایسا ہی ہے گویا اُس نے گناہ کیا ہی نہیں‘‘۔

اُس پورے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ ہرانسان غلطی،کوتاہی اور خطاء سے مرکب ہے،گویا یہ چیزیں اُس کے خمیر میں موجود ہیں اور یہ تمام خامیاں اُس کے ساتھ جُڑی ہوئی ہیں، گویا وہ اجزاءِ لاینفک ہیں،تو ایسی صورت میں ہرفردِ بشر کو چاہیے کہ وہ توبہ واستغفار کو بھی اپنا شعار بنالے اور توبہ والی صفت سے متّصف ہوجائے؛ تاکہ ہرشخص اللہ کا محبوب بن سکے اور ہرشخص اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوکہ گویا اُس نے گناہ کیا ہی نہ ہو۔ **اللّٰهم وافقنا بالتوبة والاستغفار، آمين.**

❑❖❑

احکام ومسائل

رمضانیات پر بعض فضائل کی تحقیق

از: مفتی احمد اللہ نثار صاحب قاسمی، ناظم دارالعلوم رشیدیہ وصدر دارالافتاء والارشاد حیدرآباد

رمضان سے قبل ایک موضوع روایت پھیلائی جاتی ہے کہ: ''جو شخص رمضان المبارک کے مہینے کی مبارک باد سب سے پہلے دے گا تو ایسے شخص کے لیے جنت واجب ہوجاتی ہے یا دوزخ کی آگ اس پر حرام ہوجاتی ہے''۔

رمضان کی اطلاع دینے پر ثواب

حکم: یہ روایت مردود ومَن گھڑت ہے۔

وجہ: (۱) کسی بھی مہینے کی خوش خبری یا مبارک بادی دینے پر کسی بھی قسم کے ثواب یا اجر کا ذکر کسی بھی صحیح یا ضعیف روایت میں تو درکنار کسی موضوع ومن گھڑت روایت میں بھی موجود نہیں، جب تمام احادیث کا احاطہ ائمہ محدثین نے کرلیا اور کتابیں مرتّب کردیں تو موجودہ زمانہ میں کسی بھی حدیث کی کتاب میں مذکورہ روایت کا نہ پایا جانا اس کے موضوع ہونے کی دلیل ہے۔

(۲) آن لائن دارالافتاء، دارالعلوم دیوبند نے مذکورہ روایت کے متعلق لکھا ہے کہ: ''ہمارے علم میں ایسی کوئی حدیث نہیں، جو لوگ سوشل میڈیا پر اس کو حدیث کے نام سے پھیلا رہے ہیں اُن سے اِس کا حوالہ دریافت کریں اور جب تک تحقیق سے حدیث ہونا معلوم نہ ہوجائے اُسے ہرگز شیئر نہ کریں، جو بات حدیث نہیں ہے اُس کو حدیث کہنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کرکے بیان کرنا جھوٹ، بہتان اور سخت گناہ ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔ (دارالافتاء دارالعلوم دیوبند، جواب نمبر:160406)

(۳) دارالافتاء: جامعہ علومِ اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن نے مذکورہ روایت کے متعلق اپنی تحقیق لکھی ہے کہ: ''رمضان کی سب سے پہلے دوسروں کو اطلاع دینے سے متعلق جو فضیلت عوام میں مشہور ہے کہ ''جس نے سب سے پہلے رمضان المبارک کی اطلاع دی اُس کو جہنم سے آزاد کردیا جاتا ہے'' یہ بات حدیث کی کسی بھی صحیح؛ بلکہ ضعیف اور موضوع احادیث پر لکھی گئی کتب میں بھی نہیں ملتی؛ اِس لیے اس کی نسبت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنا درست نہیں ہے؛ لہٰذا اس طرح کے پیغامات دوسروں کو ہرگز ارسال نہ کیے جائیں۔ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی بات کو غلط منسوب کرنا یعنی جو بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمائی اُس کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے بڑا سخت گناہ ہے۔

صحیح حدیث کا مفہوم ہے: جس نے مجھ پر جان کر جھوٹ بولا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔ اِسی طرح ایک روایت میں ہے: جو میری طرف ایسی بات کی نسبت کرے جو میں نے نہیں کہی اُس کو چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔ "**قال أنس: إنه ليمنعني أن أحدثكم حديثا كثيراً أن النبي صلّى اللّٰه عليه وسلم قال: من تعمد علي كذبًا، فليتبوأ مقعده من النار...... عن سلمة، قال: سمعت النبي صلّى اللّٰه عليه وسلم يقول: من يقل علي مالم أقل فليتبوأ مقعده من النار**". فقط واللہ اعلم"۔

(دارالافتاء: جامعہ علومِ اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن، فتویٰ نمبر: 144004201614)

(۴) رمضان المبارک کی آمد سے پہلے اس کی تیاری اور اہتمام کرنا اعمال اور عبادات کے ذریعے یہی اصل مقصود و مطلوب ہے اور آپ علیہ السلام نے بھی صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو اعمالِ رمضان کی طرف متوجہ کیا اور ان پر جنت کا وعدہ بھی فرمایا؛ لیکن محض خبر دینے پر یا اس کے پھیلانے پر کسی قسم کے اجر کا کوئی وعدہ مرتّب نہیں فرمایا۔[1]

(۵) رمضان کی آمد کی اطلاع دینے میں سبقت کرنے کا کوئی صحیح مطلب نہیں بنتا، اگر مراد یہ لیا جائے کہ اس کے آنے سے پہلے اس کی آمد کی خوش خبری دی جائے تو یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ شعبان کے بعد رمضان المبارک آتا ہے، یہ بات کسی کی اطلاع پر کہاں موقوف ہے؟ یہ تو ایسا ہی ہے کہ کوئی جمعرات کے دن لوگوں کو اطلاع پہنچائے کہ آئندہ کل جمعہ کا دن ہوگا اور اگر مراد یہ لیا جائے کہ کوئی شخص رمضان کے دخول کی خبر دے تو اُس میں بھی سبقت دشوار ہے؛ کیونکہ رؤیتِ ہلال سے پہلے دخول کی اطلاع تو بے کار ہے اور رؤیت پر اگر ہے تو بعض مرتبہ وہ عام ہوتی ہے اور مختلف علاقوں کے لوگوں کو حاصل ہوتی ہے، اس میں کسی کی اطلاع کو دخل نہیں ہوتا ہے، علاوہ ازیں محض ایک فرد کی رؤیت پر دخولِ رمضان کا فتویٰ نہیں دیا جائے گا؛ بلکہ وہ مفتیانِ کرام کے فیصلے پر موقوف ہے؛ اس لیے اس حدیث کا بیان کرنا، عام کرنا سب گناہ ہے۔

تراویح کے ایک سجدہ پر پندرہ سو نیکیاں

ایک حدیث یہ بیان کی جاتی ہے کہ: جب رمضان کی پہلی رات ہوتی ہے تو آسمان کے دروازے کھول دیے

(۱) تنبیہات نمبر: ۷۹۔

جاتے ہیں اور آخر رمضان تک کوئی دروازہ بند نہیں کیا جاتا اور کوئی بھی بندہ جو رمضان کی رات میں نماز پڑھتا ہے تو اس کو ڈیڑھ ہزار نیکیاں ملتی ہیں اور ہر سجدے کے بدلے جنت میں سرخ یاقوتوں کا گھر بنا دیا جاتا ہے جس کے ساٹھ دروازے ہوں گے اور ہر دروازے پر سونے کا محل ہوگا جو سرخ یاقوت سے آراستہ ہوگا، جب بندہ رمضان کا پہلا روزہ رکھتا ہے تو اس کے گزشتہ رمضان سے اب تک کے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور صبح کی نماز سے غروب آفتاب تک اس بندے کے لیے ستر ہزار فرشتے دعائے مغفرت کرتے رہتے ہیں اور اس کے لیے رمضان کے ہر سجدے کے بدلے چاہے دن میں ہو یا رات میں جنت کا ایک درخت ہے جس کے سائے میں سوار پانچ سو سال تک چل سکتا ہے۔

"إِذَا كَانَ أَوَّلُ لَيْلَةٍ مِنْ رَمَضَانَ فُتِحَتْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ فَلَايُغْلَقُ مِنْهَا بَابٌ حَتّٰى يَكُوْنَ آخِرُ لَيْلَةٍ مِنْ رَمَضَانَ وَلَيْسَ مِنْ عَبْدٍ مُؤْمِنٍ يُصَلِّيْ فِيْ لَيْلَةٍ إِلَّا كَتَبَ اللّٰهُ لَهُ أَلْفًا وَخَمْسُ مِائَةِ حَسَنَةٍ بِكُلِّ سَجْدَةٍ وَبَنٰى لَهُ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ مِنْ يَاقُوْتَةٍ حُمْرَاءَ لَهَا سِتُّوْنَ أَلْفَ بَابٍ لِكُلِّ بَابٍ مِنْهَا قَصْرٌ مِنْ ذَهَبٍ مُوَشَّحٍ بِيَاقُوْتَةٍ حُمْرَاءَ فَإِذَا صَامَ أَوَّلَ يَوْمٍ مِنْ رَمَضَانَ غَفَرَ لَهُ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ إِلٰى مِثْلِ ذٰلِكَ الْيَوْمِ مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُ كُلَّ يَوْمٍ سَبْعُوْنَ أَلْفَ مَلَكٍ مِنْ صَلَاةِ الْغَدَاةِ إِلٰى أَنْ تُوَارٰى بِالْحِجَابِ وَكَانَ لَهُ بِكُلِّ سَجْدَةٍ يَسْجُدُهَا فِيْ شَهْرِ رَمَضَانَ بِلَيْلٍ أَوْنَهَارٍ شَجَرَةٌ يَسِيْرُ الرَّاكِبُ فِيْ ظِلِّهَا خَمْسَ مِائَةَ عَامٍ"[1].

حکم: مذکورہ فضیلت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے معتبر سند سے ثابت نہیں ہے؛ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے بیان کرنے سے احتیاط کی جائے۔

وجہ: یہ روایت امام بیہقیؒ نے اپنی مشہور کتاب "شعب الایمان" میں ذکر کی ہے؛ لیکن اس کی سند میں ایک راوی ہیں "محمد بن مروان السدی" پر ائمہ جرح وتعدیل نے سخت جرح فرمائی ہے، ان سے مروی روایت کو قابلِ عمل یا قابلِ قبول نہیں مانا جائے گا اور نہ ہی اس کو بیان کی اجازت ہوگی۔

محمد بن مروان کے متعلق امام نسائی نے فرمایا: محمد بن مروان جو کوفہ کے باشندے ہیں وہ اپنے استاذ کلبی سے روایت حدیث کیا کرتے ہیں درجہ حدیث میں متروک ہیں یعنی ان کی روایت کردہ حدیث کو لیا نہیں جاتا ہے "**محمد بن مروان الكوفي يروي عن الكلبي "متروك الحديث"**"[2].

(۱) شعب الإيمان، للبيهقي، حديث نمبر: ٣٦٣٥، طبع: دارالكتب العلمية، بيروت، لبنان۔

(۲) كتاب الضعفاء والمتروكين للنسائي: ٢١٩، طبع: مؤسسة الكتب الثقافية، بيروت لبنان۔

امام ابنِ حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: محمد بن مروان السدی جو کوفہ سے تعلق رکھتے ہیں اُن پر کذب بیانی کا الزام ہے "محمد بن مروان بن عبداللّٰہ بن إسماعيل السُّدِّي، وهو الأصغر، كوفي، متهم بالكذب، من الثامنة"(۱).

امام ابنِ حبان رحمہ اللہ نے کہا: موضوع احادیث بیان کرتا ہے، اس کے حوالے سے احادیث لکھنا درست نہیں ہے "كان ممن يروي الموضوعات عن الأثبات لايحل كتابة حديثه"(۲).

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کہا: محمد بن مروان جھوٹا راوی ہے "محمد بن مروان السدي عن الأعمش، وهو كذّاب"(۳).

امام ذہبی رحمہ اللہ نے کہا: محمد بن مروان کذاب ہے "محمد بن مروان السدي كذاب"(۴).

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کی روایت نقل کرنے سے خاموشی اختیار کر لی جاتی ہے "قال البخاري: سكتوا عنه". یحییٰ بن معینؒ فرماتے ہیں کہ: یہ ثقہ راوی نہیں ہے "وقال ابن مَعين: ليس بثقة".

(۶) علاوہ ازیں روایت میں جس سجدہ کے متعلق پندرہ سونیکیاں منقول ہیں، اس میں تراویح کا کہیں ذکر نہیں ہے؛ اِس لیے واعظین وخطباء سے درخواست ہے کہ مذکورہ روایت بیان کرنے سے احتراز کریں؛ نمازِ تراویح بیس رکعات ایک اہم عبادت سنتِ مؤکدہ ہے، جس کا اجر وفضیلت اپنی جگہ مسلم ہے۔

(۷) دارالافتاء جامعۃ الرشید کراچی کے بعض اہلِ علم حضرات کی تحقیق ہے کہ اس روایت کو علامہ البانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے موضوع کہا ہے اور اس رائے میں وہ منفرد ہیں، ان سے پہلے کبارِ محدثین واصحابِ تخریج میں سے کسی نے بھی اس کو موضوع نہیں کہا؛ بلکہ محدثین کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث زیادہ سے زیادہ ضعیف ہے جس کو فضائل میں بیان کیا جا سکتا ہے؛ لہٰذا احتیاط تو اسی میں ہے کہ حتی الوسع اس کو بطور حدیثِ نبوی کے بیان نہ کیا جائے، بالخصوص فی زمانہ جب کہ لوگ صرف رمضانی مسلمان بنتے جا رہے ہیں اور جہاں ترغیب عمل کے لیے بیان کیا جائے تو یا تو محض بطور ایک روایت کے نقل کیا جائے یا سند اور روایت کی رو سے اس کی کمزوری کو بھی ساتھ بیان کیا جائے۔ (دارالافتاء جامعۃ الرشید کراچی، ۲۰ / جمادی الاولی ۱۴۴۲ھ)

(۸) عموماً مختصر عمل پر بہت زیادہ اجر وثواب سے متعلق احادیث اکثر ثبوت میں نہایت ضعیف؛ بلکہ

---

(۱) تقريب التهذيب، لابن حجر العسقلاني: ۸۹۵، الطبع: دارالعاصمة للنشر والتوزيع.

(۲) المجروحين لابن حبان: ۲/ ۲۸۶.

(۳) مجموع الفتاوى: ۲۷/ ۲۴۱.

(۴) تلخيص كتاب الموضوعات للذهبي: ۹۰.

موضوع درجہ کی ہوتی ہیں، علاوہ ازیں اس روایت کا نہ تو کوئی متابع یا شاہد ہے اور نہ کثرتِ طرق کی وجہ سے اس کے ضعف میں خفت کا امکان ہے۔

(۹) امام بیہقی رحمہ اللہ نے روایت نقل کر کے فرمایا:"قَدْ رَوَيْنَا فِي الْأَحَادِيْثِ الْمَشْهُوْرَةِ مَايَدُلُّ عَلٰى هٰذَا أَوْ بَعْضِ مَعْنَاهُ" (اور ہم نے احادیثِ مشہورہ میں بہت سی ایسی روایات نقل کی ہیں جو اس روایت کے ہم معنیٰ ہیں)۔ اس روایت کی صحت کی دلیل تو نہیں ہوسکتی؛ کیونکہ احادیثِ مشہور میں کہیں بھی ۵۱۰۰ رنیکیوں کا ذکر نہیں ہے، مطلق فضیلت کا ذکر ہے۔

(۱۰) اگر اس روایت کو موضوع نہ بھی مانا جائے تو کیا اس درجہ کی ضعیف ہے کہ مطلقاً بیانات میں بولی جاسکتی ہے؟ ضعف شدید ہے یا خفیف ہے؟ اس کے ضعف کو واضح کیے بغیر بولنے کی اجازت ہے؟ اور کیا ضعف کی وضاحت کے ساتھ بولنے کے بعد عوام بھی ضعیف ہونے کے حکم کو یاد رکھ کر نقل کرے گی یا اس کو صحت کے درجہ پر پہنچادے گی؟ جب صحیح احادیث فضائلِ رمضان و تراویح میں موجود ہیں تو شدید مختلف فیہ روایات کا سہارا لینے کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے؟

تراویح کے ایک سجدہ پر ڈیڑھ لاکھ نیکیاں

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ رمضان کی ایک رات میں باہر نکلے، دیکھا مسجدوں میں قندیلیں روشن ہیں اور لوگ قرآن پڑھ رہے ہیں، آپ نے کہا: اللہ تعالیٰ عمرؓ کی قبر کو روشن کرے جیسے اُنھوں نے ہماری مسجدوں کو روشن کیا۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے تراویح کی ۲۰ ررکعات پڑھیں اللہ تعالیٰ اُس کو جنت میں ۲۰ رشہر عطا فرمائیں گے، ہر شہر اتنا بڑا ہوگا کہ اس میں آدمی ایک مہینہ تک چلتا رہے تو پھر بھی ختم نہ ہو۔ فرمایا: جو ایمان دار بندہ بھی ان راتوں میں سے کسی رات میں نمازِ تراویح پڑھتا ہے، اس کے لیے ہر سجدے کے بدلے اللہ تعالیٰ ڈیڑھ ہزار نیکیاں لکھتا ہے اور اس کے لیے جنت میں ایک گھر سرخ یاقوت سے بناتا ہے، جس کے ساٹھ ہزار دروازے ہوں گے اور ان میں سے دروازہ کے متعلق ایک محل سونے کا جو سرخ یاقوت سے آراستہ ہوگا۔

حکم: مذکورہ فضیلت کسی صحیح یا موضوع روایات والی کتاب میں بھی دستیاب نہیں ہوئی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے بیان کرنا جائز نہیں ہے، جب ۱۵۰۰ رنیکیاں ایک سجدے پر ملنے والی روایت ہی محل کلام ہے تو ڈیڑھ لاکھ کی روایت کو کہاں سے ثابت کیا جائے گا؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو افطار کے وقت کی فضیلت

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی جس میں اس امت کے فضائل میں یہ بات بھی بیان فرمائی کہ اے موسیٰ! جب میں تم سے بات کرتا ہوں تو میرے اور تمھارے درمیان ستر ہزار پردے ہوتے ہیں؛ لیکن امتِ محمدیہ جب افطار کے وقت مجھ سے دعا مانگے گی تو میرے اور ان کے درمیان کوئی پردہ نہ ہوگا۔"إن لي عبادا أخرجهم في آخر الزمان وأكرمهم بشهر رمضان فأكون أقرب لأحدهم منک، لأنک كلمتني وبيني وبينک سبعون ألف حجاب، فإذا صامت أمة محمد صلّى اللّٰه عليه وسلم حتى ابيضت شفاهم، واصفرت ألوانهم ارفع الحجب بيني وبينهم وقت افطارهم"۔(۱)

حکم: مذکورہ روایت من گھڑت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے بیان کرنا جائز نہیں ہے۔

وجہ: ☆موضوعات کے علاوہ مستند کتابوں میں دستیاب نہیں ہے، اگر یہ حدیث ثابت ہوتی تو کتبِ احادیثِ صحیحہ میں ضرور مذکور ہوتی۔

☆اور شرعاً بھی یہ بات درست نہیں ہے؛ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جلیل القدر نبی ہیں، ان سے ہم کلامی پر پردے رہیں اور امتِ محمدیہ انبیاءِ کرام علیہم السلام سے تو افضل ہرگز نہیں ہے، اس امت کے صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ بھی بنی اسرائیل کے کسی نبی سے افضل نہیں ہیں، امتی کی ایسی فضیلت جس سے نبی کی تعظیم میں فرق یا بے ادبی کا پہلو ہو ایسا کلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہی نہیں ہوسکتا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذاتِ عالی کو انبیاءِ کرام علیہم السلام کی ذوات سے تقابل کرنے اور تفضیل کی بات کرنے سے منع فرمادیا تو اپنی امت کو انبیاء پر کیونکر بڑھادیں گے۔

رمضان میں انتقال کی فضیلت

(۱) شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: یہ مضمون تو حدیث میں ہے کہ رمضان المبارک کے مہینے میں امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روزے داروں کے لیے جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کردیے جاتے ہیں؛ البتہ"ماہِ رمضان میں وفات پانے والا شخص سیدھا جنت میں جاتا ہے اور قیامت کے دن اس کا کوئی حساب کتاب نہیں ہوگا" یہ مضمون تلاشِ بسیار کے بعد بھی احادیث میں نہیں مل سکا،

(۱) نزهة المجالس:۱۸۲، روح البيان:۱۱۲/۸.

تاہم رحمتِ خداوندی سے بعید بھی نہیں ہے کہ اِس مبارک مہینے کی برکت سے اس ماہ میں انتقال کرنے والے ایمان والوں کے ساتھ یہ معاملہ کیا جائے۔ ’’عن ابن عباس رضي اللّٰہ عنه أنه سمع رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیه وسلم یقول: إن الجنة لتبخر وتزین من الحول إلی الحول لدخول شهر رمضان، فإذا کانت أول لیلة من شهر رمضان، هبت ریح من تحت العشر وفیه: ثم یقول: هذهه أول لیلة من شهر رمضان فتحت أبواب الجنة علی الصائمین من أمة محمد صلّی اللّٰہ علیه وسلم، قال: ویقول اللّٰہ عز وجل: یارضوان! افتح أبواب الجنان، ویامالک! أغلق أبواب الجحیم علی الصائمین من أمة محمد صلّی اللّٰہ علیه وسلم‘‘(۱)۔

(۲) فتاویٰ شامی میں ہے کہ جمعہ ورمضان کے مہینے میں عذابِ قبر ہٹا دیا جاتا ’’ویرفع عنه یوم الجمعة وشهر رمضان‘‘(۲)۔

(۳) کتاب ’’مرنے کے بعد کیا ہوگا‘‘ میں بیہقی کے حوالے سے منقول ہے کہ رمضان کے مہینے میں مُردوں سے عذابِ قبر ہٹا دیا جاتا ہے ’’إن عذاب القبر یرفع عن الموتیٰ في شهر رمضان‘‘(۳)۔

اِس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جولوگ پہلے سے عذاب میں مبتلا تھے انہیں رمضان میں عذاب سے دُور رکھا جاتا ہے، یا یہ مطلب ہے کہ جولوگ رمضان میں انتقال ہوتے ہیں، ان سے عذاب اُٹھالیا جاتا ہے(۴)۔

(۴) انیس الواعظین میں ہے کہ: جوخوش نصیب مسلمان ماہِ رمضان میں انتقال کرتا ہے تو اُس کو سوالاتِ قبر کے عذاب سے امان مل جاتی ہے، عذابِ قبر سے نجات پاتا ہے اور جنت میں داخل ہو جاتا ہے اور جو مؤمن اس مہینے میں مرتا ہے وہ سیدھا جنت میں جاتا ہے، گویا اُس کے لیے دوزخ کا دروازہ بند ہے(۵)۔

نوٹ: ’’انیس الواعظین‘‘ نامی کتاب ایک شیعہ عالم ’’ملاعبدالکریم‘‘ کی بھی ہے، اہلِ تشیع کی کتب کا کوئی اعتبار نہیں؛ البتہ ربِّ ذوالجلال کے فضل سے اگر انتقال ہونے والے کو یہ فضیلت حاصل ہو جائے تو یہ خدا کا فضل ہے اور اگر حاصل نہ ہو تو پھر یہ خدا کا عدل ہے۔

تبصرہ: عوام وخواص میں مشہور ہے کہ جمعہ کے دن یا رمضان کے مہینے میں فوت ہونے والا شخص تا قیامت

---

(۱) فضائلِ رمضان: ۵۶ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ، بحوالہ: الترغیب، وابن حبان والبیہقی، ادارہ اشاعتِ دینیات۔

(۲) فتاویٰ شامي: ۴۴/۳ مطلب مااختص به الجمعة.

(۳) أهوال القبور وأحوال أهلها إلی النشور: ۱۰۵.

(۴) التذکرة في أحوال الموتیٰ: ۱۲۴/۱، باب ماینجی المؤمن من أحوال القبر، دارالکتب العلمیة.

(۵) انیس الواعظین: ۲۵۔

عذابِ قبر(عذابِ برزخ) سے محفوظ ہوجاتا ہے،خواہ مرنے والا فاسق وفاجر ہواور کفار کے متعلق خیال ہے کہ اگر وہ یومِ جمعہ اور ماہِ رمضان میں فوت ہوں تو اس دن اور ایک مہینے تک عذاب موقوف رکھا جاتا ہے۔

جہاں تک رمضان کے مہینے میں فوت ہونے والے کے عذابِ قبر سے محفوظ ہونے کا معاملہ ہے،تو اس کا کسی حدیث میں صراحتاً ذکر نہیں ہے؛البتہ ابونعیم اصبہانی نے حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کی سند سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد روایت کیا ہے کہ: جس کی موت رمضان مکمل ہونے کے وقت واقع ہوئی،تو وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس کی موت وقوفِ عرفہ مکمل ہونے کے وقت واقع ہوئی تو وہ جنت میں داخل ہوگا،جس کی موت صدقہ مکمل کرنے کے وقت واقع ہوئی تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔"**من وافق موته عند انقضاء رمضان دخل الجنة، ومن وافق موته عند انقضاء عرفة دخل الجنة، ومن وافق موته عند انقضاء صدقة دخل الجنة**"(۱).

حکم: رمضان میں فوت ہونے والے کو قبر کا عذاب ہمیشہ کے لیے موقوف رہے گا،صحیح سند سے ثابت نہیں ہے؛اِس لیے اس کا اعتقاد یا بیان کرنا درست نہیں ہے۔

وجہ: اوّلاً: تو یہ حدیث غیر معمولی ضعیف ہے،اس کی سند میں ایک راوی نصر بن حماد ہے،جس کو محدثین نے "**كذاب، متروك الحديث، ليس بشيء، ذاهب الحديث، يهم في الإسناد**" وغیرہ القاب سے نوازا ہے۔

ثانیاً: روایت میں رمضان کے اختتام کی شرط ہے، درمیانِ رمضان یا ابتدائے رمضان میں فوت ہونے والے کو یہ فضیلت حاصل نہ ہوگی۔

ثالثاً: روایت میں جنت میں داخلے کا ذکر ہے،موت کے بعد قبر میں عذاب ہونے نہ ہونے کا کوئی ذکر نہیں ہے،تو کیسے عذابِ قبر وبرزخ سے محفوظ ہونے پر اس روایت سے استدلال کیا جائے گا؟

☆دوسری روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے ہے کہ:"**إن عذاب القبر يرفع عن الموتیٰ في شهر رمضان**"(۲).

---

(۱) حلیۃ الأولیاء:۲۶/۵،حدیث:۶۱۸۷،یہ روایت ضعیف ہے،اِس کی سند میں نصر بن حماد بن عجلان متروک ہے،امام ابوحاتم الرازی رحمہ اللہ نے کہا: متروک الحدیث."الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم:۴۷۰/۸"،امام ابنِ معین رحمہ اللہ نے کہا: کذّاب. "الضعفاء الكبير للعقيلي:۳۰۰/۴"۔

(۲) أهوال القبور وأحوال أهلها إلى النشور:۱۰۵.

تبصرہ: اِس حدیث کی سند بھی نہایت ضعیف ہے جس سے عذابِ قبر کا مسئلہ (جو عقائد میں سے ہے) ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

جہاں تک جمعہ کے دن وفات پانے پر عذابِ قبر سے حفاظت کا مسئلہ ہے تو اس سلسلے میں متعدد احادیث پائی جاتی ہیں؛ مگر بعض اہلِ علم حضرات نے ان احادیث کو سند کے اعتبار سے غیر معتبر قرار دیا ہے، تو بعض حضرات نے مجموعی طور پر ان روایات کو حسن قرار دیا ہے۔(۱)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: "**مامن مسلم یموت یوم الجمعة أو لیلة الجمعة إلا وقاه الله فتنة القبر**"۔(۲)

اس کے علاوہ ابونعیم اصبہانیؒ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے حلیۃ الاولیاء (۱۵۵/۳) میں، ابویعلی موصلیؒ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے مسند ابی یعلی (۱۴۶/۷، حدیث:۴۱۱۳) میں، عبدالرزاقؒ نے ابنِ شہاب زہریؒ کے حوالہ سے مسلاً اپنی کتاب مصنف عبدالرزاق (حدیث:۵۵۹۵) میں،

(۱) جمعہ کے دن وفات پانے سے متعلق عذاب قبر نہ ہونے کی بات متعدد احادیث سے ثابت ہے، وہ احادیث اگر چہ متکلم فیہ ہیں؛ لیکن تعدد طرق کی وجہ سے فضائل میں انھیں قبول کیا جا سکتا ہے۔ قال رسول اللّٰہ صلّی الله علیه سلم: مامن مسلم یموت یوم الجمعة أولیلة الجمعة إلا وقاه الله فتنة القبر. (سنن الترمذی، أبواب الجنائز، باب ماجاء فیمن یموت یوم الجمعة: ۲۰۵/۱، وقال: هذا حدیث غریب ولیس اسناده بمتصل) یہ صورت قیامت تک یوں ہی برقرار رہے گی یا بعد میں کسی وقت عذاب ممکن ہے؟ اِس بارے میں علماء کی آراء مختلف ہیں۔

حکیم ترمذیؒ نے نوادرالاصول میں لکھا ہے کہ: "تکوینی طور پر کسی شخص کی موت کا جمعہ کے دن یا رات کے موافق ہو جانا اس کی سعادت مندی کی دلیل ہے اور یہ سعادت صرف اسی کو حاصل ہوتی ہے جسے اللہ تعالی کی جانب سے فتنۂ قبر سے محفوظ رکھا جانا منظور ہوتا ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ تا قیامت اس سے محفوظ رہے، بالخصوص اس وجہ سے بھی کہ بعض روایات میں جمعہ کے دن وفات پانے والے کو درجۂ شہادت کا مستحق بھی قرار دیا گیا ہے اور شہید کا عذابِ قبر سے محفوظ رہنا طے شدہ امر ہے"۔

اِس کے برخلاف ملا علی قاریؒ نے شرح فقہ اکبر میں اِس موضوع پر کلام کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ: "اس مسئلے کا تعلق چونکہ عقائد سے ہے؛ لہٰذا اس کے بارے میں جب تک کوئی مضبوط روایت یا نص قطعی نہ ہو، کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی"۔

تاہم علماء کے اِس اختلاف کے باوجود اگر کوئی شخص جمعہ کے دن وفات سے متعلق فضیلت کی حدیث کو عمومی معنیٰ میں رکھتے ہوئے اللہ تعالی کی رحمت سے اُمید رکھے تو اس میں کوئی مضائقہ معلوم نہیں ہوتا۔

(۲) سنن ترمذی، باب ماجاء فیمن مات یوم الجمعة، حدیث:۱۰۷۴، اس کی سند کو امام ترمذیؒ نے "غریب" اور "منقطع" قرار دیا ہے اور بعض محدثین نے "منکر" قرار دیا ہے۔ (میزان الاعتدال، تحت رقم الترجمة:۹۲۲۴)

امام حصکفیؒ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے مسند ابی حنیفہ (حدیث: ٦٦، کتاب الصلاۃ) میں ذکر کیا ہے؛ مگر ہر روایت پر غیر معمولی کلام ہے، تفصیل کے لیے دیکھیں۔(۱)

علاوہ ازیں ان تمام احادیث میں کہیں ذکر نہیں ہے کہ کس طرح کا عذاب موقوف رہے گا سخت عذاب موقوف رہے گا یا ہر طرح کا عذاب یا سوال وجواب موقوف رہیں گے، کب تک موقوف رہے گا کہ اسی جمعہ رمضان یا ہر جمعہ وہر رمضان یا تا قیامت، کوئی صراحت احادیث میں نہیں ہے۔

چنانچہ ملاعلی قاریؒ لکھتے ہیں: یہ بات مخفی نہیں کہ عقائد میں اعتبار یقینی دلائل کا ہوتا ہے اور احادیثِ آحاد اگر ثابت ہوں تو وہ صرف ظنی درجے کی ہوتی ہیں، ان سے قطعیت کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا اور یقین کا عقیدہ ثابت نہیں ہوتا؛ مگر یہ کہ جب ان کی سندیں اتنی زیادہ ہوں کہ وہ تواترِ معنوی کے درجے میں آجائیں، تو پھر وہ قطعی بن جاتی ہیں؛ البتہ فی الجملہ احادیث سے یہ بات ثابت ہیکہ جو شخص جمعہ کے دن یا جمعہ کی رات میں فوت ہوجائے تو اس سے عذاب کو اُٹھالیا جاتا ہے؛ مگر یہ بات کہ ”قیامت تک اس کی طرف عذاب لوٹایا نہیں جائے گا“ مجھے اس کی اصل معلوم نہیں ہوسکی، اوراسی طرح جمعہ کے دن اور جمعہ کی رات میں مطلقاً ہر گناہ گار سے عذاب کا رفع ہونا اور قیامت کے دن تک لوٹ کر نہ آنا، تو یہ بات قطعی طور پر باطل ہے (کیونکہ یہ دعویٰ احادیثِ صحیحہ کثیرہ کی دلالت کے خلاف ہے۔

”فلایخفٰی: أن المعتبر في العقائد هو الأدلة اليقينية وأحاديث الآحاد لوثبتت إنما تكون ظنية اللّٰهم إلا إذا تعدد طرقه بحيث صار متواترا معنويا فحينئذ قد يكون قطعيًا......الخ“.(۲)

عذابِ قبر سے حفاظت کے چار اسباب ہیں:

(۱) ذات کی عظمت کی وجہ سے عذابِ قبر سے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ جیسے انبیاءؑ، شہداء اور معصوم بچے وغیرہ۔

(۲) عملِ صالح کی وجہ سے مثلاً سورۂ ملک کی تلاوت کو معمول بنانے والے کو **”هي المنجية تنجيه من عذاب القبر“**.(۳)

(۳) زمانہ کی عظمت کی وجہ سے۔ جیسے جمعہ کے دن یا جمعہ کی رات مرنے والے کو **”مامن مسلم يموت يوم الجمعة، أو ليلة الجمعة إلا وقاه اللّٰه فتنة القبر“**.(۴)

---

(۱) ماہِ رمضان کے فضائل واحکام: ۵۵۷تا۵۶۵، از: مفتی رضوان راولپنڈی۔

(۲) شرح الفقہ الاکبر للملاعلی قاریؒ: ۱۰۱، قدیمی کتب خانہ کراچی۔

(۳) فتاویٰ شامی: ۳/۴۴، مطلب مااختص به الجمعة.

(۴) سنن ترمذی، کتاب الجنائز: ۱/۲۰۵۔

(۴) مکان کی عظمت کی وجہ سے۔ جیسے حدودِ حرمِ مکی اور حدودِ حرمِ مدنی کی سرزمین میں مرنے والے کو "من مات في أحد الحرمين بعث آمناً"۔[1]

ان چار اسباب میں سے رمضان میں دو اسباب عموماً پائے جاتے ہیں: ایک زمانے کی عظمت، دوسرے عملِ صالح کے مواقع؛ چونکہ جنت کے دروازے کھل گئے، جہنم کے دروازے بند ہوگئے، برسوں کا پاپی بھی دیکھا دیکھی کارِ خیر میں حصہ لینے کی کوشش کرتا ہے، ظاہر ہے کہ عملِ صالح جنت میں داخلہ کا سبب ہے، اس سے رمضان میں مرنے والے کا عذابِ قبر سے محفوظ رہنا معلوم نہیں ہوتا ہے، جنت کا داخلہ ملے؛ مگر عالمِ برزخ کی کارروائی مکمل ہونے کے بعد ﴿اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾۔

نیز غور کرنے کی بات یہ ہے کہ انسان ان چار اسباب میں سے کس سبب پر قادر ہے؟ ہر عقل مند جانتا ہیکہ انسان عملِ صالح پر قادر ہے، رمضان، جمعہ اور حرمین میں مرنے پر قادر نہیں ہے کہ موت ہندوستان میں آرہی ہو یا ہفتے کے دن آرہی ہو تو اسے حرمین اور رمضان تک مؤخر کردے اور نہ ہی اپنی ذات کو معزز بنا کر نبی وشہید کے درجے تک پہنچا سکتا ہے، پس انسان کو چاہیے کہ جس پر وہ قادر ہے اُس میں مشغول رہے، اللہ سے خیر کی اُمید رکھے، باقی معاملہ ربِّ کریم کے کرم پر چھوڑ دے، اس کی رحمت نہ زمانے پر محدود ہے، نہ ہی مکان پر محدود ہے؛ مگر ظاہر ہے اس کا تعلق اللہ کی مشیت سے ہے اور عالمِ برزخ ہماری نظروں سے پردۂ غیب اللہ حسنِ ظن کا تو وہ بہت ہی ضروری ہے؛ مگر حسنِ ظن پر عقائد کی بنیاد نہیں رکھی جاتی۔

رمضان میں انتقال ہونے والا فتاویٰ کی روشنی میں:

☆ فتاویٰ محمودیہ میں مفتی صاحبؒ نے لکھا ہے: رمضان شریف میں جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کردیے جاتے ہیں، جس سے معلوم ہوا کہ جو شخص رمضان شریف میں مرتا ہے وہ بھی عذاب سے محفوظ رہتا ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ مبوّب: ۱/۶۳۰)

☆ مفتی رشید احمد صاحبؒ نے احسن الفتاویٰ میں لکھا ہے: رمضان اور جمعہ کے دن فوت ہونے والے سے ہمیشہ کے لیے عذابِ قبر مرتفع ہوجاتا ہے۔ (احسن الفتاویٰ: ۴/۲۰۹)

☆ جامعہ علوم اسلامیہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کا فتویٰ ہے کہ "رمضان المبارک اور جمعہ کے دن انتقال کرنے والوں کے بارے میں روایات میں آتا ہے اُن سے قبر کا عذاب ہٹا دیا جاتا ہے، اب یہ عذاب صرف رمضان المبارک اور جمعہ کے دن ہٹایا جاتا ہے یا تا قیامت، تو اس کے بارے میں بعض علماء فرماتے ہیں: صرف ماہِ رمضان المبارک

(۱) المعجم الأوسط للطبراني: ۶/۲۵۰، حدیث: ۵۸۸۳۔

اور جمعہ کے دن یہ عذاب اُٹھا دیا جاتا ہے اور بعض فرماتے ہیں: تا قیامت ان سے قبر کا عذاب ہٹا دیا جاتا ہے اور یہ قبر میں راحت و آرام کے ساتھ رہتے ہیں، زیادہ راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے حق میں یہ حکم عموی ہیکہ اگر کسی مسلمان کا انتقال رمضان المبارک یا جمعہ کے دن ہوجائے تو تا قیامت عذابِ قبر و منکر نکیر کے سوال سے محفوظ رہے گا اور اللہ کی رحمت سے یہ بعید بھی نہیں کہ وہ حشر میں بھی اس سے حساب نہ لیں، جیسا کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات میں ہے، فرمایا: ''رمضان میں اگر انتقال ہو تو ایک قول یہ ہے کہ قیامت کے دن حساب نہیں ہوتا، یہی جی کو لوتا ہے اور أنـا عـنـد ظـن عبـدي بـي پر عمل کرے''۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۲۶/۴۰۴) اور اگر کوئی غیر مسلم رمضان المبارک میں مرجائے تو صرف ماہِ مبارک کے احترام میں رمضان المبارک تک عذابِ قبر سے محفوظ رہے گا، اور رمضان کے بعد پھر اسے عذاب ہوگا۔

''قال أهل السنة والجماعة: عذاب القبر حق وسؤال منكر ونكير وضغطة القبر حق، لكن إن كان كافرًا فعذابه يدوم إلٰى يوم القيامة ويرفع عنه يوم الجمعة وشهر رمضان، فيعذب اللحم متصلًا بالروح والروح متصلًا بالجسم فيتألم الروح مع الجسد، وإن كان خارجا عنه، والمؤمن المطيع لايعذب بل له ضغطة يجد هول ذٰلک وخوفه، والعاصي يعذب ويضغط لوكن ينقطع عنه العذاب يوم الجمعة وليلتها، ثم لايعود وإن مات يومها أوليلتها يكون العذاب ساعةً واحدةً وضغطة القبر صم قطع، كذا فى المعتقدات للشيخ أبي المعين النسفي الحنفي من حاشية الحنفي ملخصًا''۔[1]

☆ آن لائن دارالافتاء دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ ہے کہ: ''رمضان میں انتقال کرنے والے کے متعلق جنتی ہونے کی بشارت احقر کی نظر سے نہیں گزری؛ البتہ عذابِ قبر نہ ہونے یا اُٹھ جانے کی بشارت آئی ہے''۔[2]

اور اللہ رب العزت کی رحمت بے کراں سے ماہِ رمضان جیسے عظیم الشان و بابرکت مہینہ میں اس طرح کی فضیلت کسی گنہگار کے حق میں کچھ مستبعد نہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی گنہگار کے حق میں اس کے گناہ کی شدت رمضان کی اس فضیلت سے مانع ہو، اللہ تعالیٰ اعلم۔[3]

دوسرے فتوے میں ہے کہ: ''اگر کسی فاسق مسلمان کی موت رمضان المبارک یا جمعہ میں ہوجائے تو اس کو

---

(۱) فتاویٰ شامی: ۲/۱۶۵، بحوالہ: دارالافتاء جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن، فتویٰ نمبر: 143909200282۔

(۲) شامی: ۳/۴۴، مطبوعہ: مکتبہ زکریا دیوبند اور احسن الفتاویٰ: ۴/۲۰۸، مطبوعہ: ایچ ایم سعید کراچی۔

(۳) دارالافتاء دارالعلوم دیوبند، جواب نمبر: 153699۔

ہلکا عذاب ہوگا، اس کے بعد قیامت تک مرتفع ہوجاتا ہے اور وہ عذابِ قبر سے محفوظ رہے گا اور اگر کسی کافر کی موت ان ایام میں ہوجائے تو اس سے صرف رمضان المبارک اور جمعہ میں عذاب مرتفع ہوگا، رمضان وجمعہ گزرنے کے بعد پھر اُس پر عذاب ہوگا اور اگلا رمضان وجمعہ آنے پر پھر اُس سے عذاب اُٹھالیا جائے گا اور یہی سلسلہ جاری رہے گا، یہی تمام اہل السنۃ والجماعت کا عقیدہ ہے؛ چنانچہ ردالمحتار میں ہے: ''قال أهل السنة عذاب القبر حق وسؤال نكير ومنكر حق وضغطة القبر حق لكن إن كان كافرا فعذابه يدوم إلٰى يوم القيامة ويرفع عنه يوم الجمعة وشهر رمضان والعاصي يعذب ويضغط لكن ينقطع عنه العذاب يوم الجمعة وليلتها ثم لايعود، وإن مات يومها أو ليلتها يكون العذاب ساعة واحدة وضغطة القبر ثم يقطع''[1]۔

☆مفتی سلمان منصور پوری صاحب دامت برکاتہم لکھتے ہیں کہ: ''رمضان المبارک میں انتقال کرنے والے شخص سے قبر کا عذاب ہٹائے جانے کا ثبوت بعض ضعیف روایات سے ہوتا ہے؛ لیکن ان میں تاقیامت کی قید نہیں ہے، انہیں کو بنیاد بنا کر مذکورہ کتابوں میں رمضان المبارک میں وفات پانے والوں کے متعلق مذکورہ بات لکھی گئی ہے''۔

آگے لکھتے ہیں کہ: ''متعدد طرق سے یہ حدیث مروی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''جو شخص جمعہ کے دن یا اس کی رات میں انتقال کرجائے وہ قبر کے فتنہ سے محفوظ رکھا جاتا ہے'' اور قبر کے فتنہ میں بظاہر سوال وجواب اور عذاب دونوں شامل ہیں، یعنی ایسا شخص دونوں باتوں سے بچا رہتا ہے، اب یہ صورت قیامت تک یوں ہی برقرار رہے گی یا بعد میں کسی وقت عذاب ممکن ہے؟ اس بارے میں علماء کی آراء مختلف ہیں: حکیم ترمذیؒ نے نوادرالاصول میں لکھا ہے کہ: ''تکوینی طور پر کسی شخص کی موت کا جمعہ کے دن یا رات کے موافق ہوجانا اُس کی سعادت مندی کی دلیل ہے اور یہ سعادت صرف اسی کو حاصل ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے فتنۂ قبر سے محفوظ رکھا جانا منظور ہوتا ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ تاقیامت اس سے محفوظ رہے، بالخصوص اس وجہ سے بھی کہ بعض روایات میں جمعہ کے دن وفات پانے والے کو درجۂ شہادت کا مستحق بھی قرار دیا گیا ہے اور شہید کا عذابِ قبر سے محفوظ رہنا طے شدہ امر ہے''۔

تنبیہ: ☆ہمارے اکابر کے علاوہ دیگر اہلِ علم حضرات نے بھی اسی طرح کی بات اپنے فتاویٰ میں لکھی ہے؛ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ جب جہنم کے دروازے بند ہوں تو رمضان میں مرنے والے پر ہی سے عذاب کیوں موقوف ہو؛ بلکہ جو رمضان سے پہلے مرے ہیں اُن کے لیے بھی جہنم کے دروازے بند ہیں تو انھیں بھی عذابِ قبر نہ ہونا چاہیے، نتیجہ یہ کہ ماہِ رمضان میں کسی کو عذاب نہ ہو، خواہ کبھی بھی انتقال ہوا ہو۔

---

(۱) ردالمحتار: ۳/۴۴، مکتبہ زکریا دیوبند، جواب نمبر: 54438۔

☆اس کے برخلاف ملاعلی قاریؒ نے شرح فقہِ اکبر میں اِس موضوع پر کلام کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ: ''اس مسئلہ کا تعلق چونکہ عقائد سے ہے؛ لہٰذا اس کے بارے میں جب تک کوئی مضبوط روایت یا نصِ قطعی نہ ہو کوئی قطعی بات نہیں کہی جاسکتی''۔ تاہم علماء کے اِس اختلاف کے باوجود اگر کوئی شخص جمعہ کے دن وفات سے متعلق فضیلت کی حدیث کو عمومی معنٰی میں رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید رکھے تو اس میں کوئی مضائقہ معلوم نہیں ہوتا۔

قال الحكيم الترمذي في نوادر الأصول: ومن مات يوم الجمعة فقد انكشف له الغطاء عما له عند اللّٰه؛ لأن يوم الجمعة لاتسجر فيه جهنم وتغلق أبوابها، ولايعمل سلطان النار فيه مايعمل سائر الأيام، فإذا قبض اللّٰه عبدًا من عبيده فوافق قبضه يوم الجمعة كان ذٰلک دليلًا لسعادته وحسن مآبه، وإنه لايقبض في هٰذا اليوم إلا من كتب له السعادة عنده فلذٰلک يقيه فتنة القبر.(۱)

وقال الملا علي قاري رحمة اللّٰه عليه: فلايخفى أن المعتبر في العقائد هو الأدلة اليقينية وأحاديث الأحاد لوثبت إنما تكون ظنية، نعم ثبت في الجملة أن من مات يوم الجمعة أوليلة الجمعة يرفع العذاب عنه إلا أن لايعود إليه إلٰى يوم القيامة فلاأعرف له أصلًا له.(۲)

روزہ کی حالت میں وفات کا ثواب

☆ اُمّ المؤمنین سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس کا روزہ کی حالت میں انتقال ہوا، اللہ عزوجل اُس کو قیامت تک کے روزوں کا ثواب عطا فرماتا ہے۔

”عن هشام بن عروة عن أبيه عن عائشة رضي اللّٰه عنها قالت: قال رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلم: من مات صائما أوجب اللّٰه له الصيام إلٰى يوم القيامة“.(۳)

☆حدیث میں تین لوگوں کے لیے جنت کی بشارت سنائی گئی: (۱) جو شخص اخلاص کے ساتھ ”لَا إِلٰـهَ إِلَّا اللّٰهُ“

(۱) شرح الصدور بشرح حال الموتى والقبور للسيوطي: ۲۰۹، مكتبة دارالتراث المدنية المنورة، مرقاة المفاتيح للملاعلي القاري: ۲/۲۴۲.

(۲) شرح الفقه الأكبر للملاعلي قاري:۱۷۳، بحواله: كتاب النوازل:۱/۲۰۲.

(۳) أهوال القبور وأهوال أهلها إلى النشور:۱۰۵.

کہتا ہے اُس کے لیے جنت واجب ہوجاتی ہے (۲) جو شخص اللہ کے لیے روزہ رکھتا ہے اُس کے لیے جنت واجب ہوجاتی ہے (۳) جو شخص اللہ کے لیے صدقہ دے اُس کے لیے جنت واجب ہوجاتی ہے "مَنْ قَالَ لَاإِلٰهَ إِلَّااللّٰهُ ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ خُتِمَ لَهٗ بِهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ، وَمَنْ صَامَ يَوْمًا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ خُتِمَ لَهٗ بِهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ، وَمَنْ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ خُتِمَ لَهٗ بِهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ"[1]. وقال الألباني في أحكام الجنائز: إسناده صحيح.

☆ایک روایت میں ہے کہ روزہ کی حالت میں مرجائے تو جنت میں داخل ہوگا، افطار کے بعد انتقال ہوتو جنت؛ چونکہ اعتبار خاتمہ کا ہوتا ہے اور خاتمہ کے وقت روزہ میں تھا۔ "فَمَنْ مَاتَ صَائِمًا دَخَلَ الْجَنَّةَ، وَمَنْ مَاتَ بَعْدَ اِفْطَارِهٖ وَكَانَ صَائِمًا دَخَلَ الْجَنَّةَ، إِذَا خُتِمَ لَهٗ بِالصِّيَامِ، فَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا: أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيمِ". (رواه ابن حبان، كِتَابُ الْبِرِّ وَالْإِحْسَانِ، ذِكْرُ الْبَيَانِ بِأَنَّ الْمَرْءَ يَجِبُ أَنْ يَعْتَمِدَ مِنْ عَمَلِهِ عَلٰى آخِرِهٖ دُوْنَ أَوَائِلِهٖ، حديث نمبر: ٣٤٠، بسند صحيح)

تنبیہ: ☆حدیث ضعیف جب کہ درجۂ موضوع تک نہ پہنچی ہو فضائل میں حجت ہے، مسائل (حلال وحرام) میں حجت نہیں ہے، یحیٰ ابن معینؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور دیگر محدثین کا قول ہے: جب ہمارے پاس کوئی حدیث حلال وحرام سے متعلق آتی ہے تو ہم خوب سختی کرتے ہیں، اچھی طرح جانچ پڑتال کرتے ہیں اور جب فضائل سے متعلق کوئی حدیث آتی ہے تو ہم نرمی اختیار کرتے ہیں، خوب تحقیق نہیں کرتے۔ "إذا جاء نا في الحلال والحرام تشددنا، وإذا جاء نا في الفضائل تسهلنا"[2].

☆مذکورہ حدیث سے روزہ کی حالت میں وفات پر پانے پر جنت کی بشارت ہے؛ البتہ بغیر حساب کے جنت میں جانے کی وضاحت نہیں ہے؛ بغیر حساب کے جنت میں جانے والوں کی صفات پر مستقل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے: "أنه ليس فيه تلك الفضيلة الخاصه؛ دخول الجنة بغير حساب".

☆مذکورہ فضیلت محض رمضان میں فوت ہونے پر نہیں ہے؛ بلکہ روزہ و نیکی کی حالت میں فوت ہونے پر فضیلت ہے۔ "الحديث الذي سبق ذكره، في فصل من مات صائما، دل علٰى أن دخول الجنة إنما كان موعودا علٰى عمل صالح، ختم له به، وليس علٰى مجرد الموت في شهر رمضان".

(الإسلام سوال وجواب، محمد صالح المنجد، سوال نمبر:49759، تاريخ النشر:9/2/2004)

---

(۱) أهوال القبور وأحوال أهلها إلى النشور:١٠٥.

(۲) أهوال القبور وأحوال أهلها إلى النشور:١٠٥.

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث کی تحقیق

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان کے آخری روز ہمیں خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''لوگو! تم پر عظیم الشان مہینہ سایہ فگن ہورہا ہے، یہ بابرکت مہینہ ہے، اس میں ایک ایسی رات ہے جو ایک ہزار مہینوں سے بہتر ہے، اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اس کے روزے فرض کیے ہیں اور اس مہینے کی راتوں کا قیام نفل کیا ہے، جس نے بھی اس مہینے میں کوئی خیر و بھلائی کا کام سرانجام دے کر قرب حاصل کیا تو وہ ایسے ہی ہے جیسے کہ اُس نے اس مہینے کے علاوہ میں کوئی فرض ادا کیا اور جس نے اس مہینے میں کوئی فرض سرانجام دیا تو وہ ایسے ہی ہے جیسے کسی نے اس مہینے کے علاوہ میں ستر فرض ادا کیے، یہ صبر کا مہینہ ہے، اور صبر کا ثواب جنت ہے، یہ خیر خواہی کا مہینہ ہے، اِس ماہِ مبارک میں مؤمن کا رزق زیادہ ہوجاتا ہے اور جس کسی نے بھی اس مہینے میں روزے دار کا روزہ افطار کرایا اُس کے گناہ معاف کردیے جاتے ہیں اور اس کی گردن جہنم سے آزاد کردی جاتی ہے، اور اسے بھی اتنا ہی اجر وثواب حاصل ہوتا ہے جتنا کہ روزے دار کو حاصل ہوتا ہے اور کسی کے ثواب میں کمی نہیں ہوتی، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ہم میں سے ہر ایک کے پاس تو روزہ افطار کرانے کے لیے کچھ نہیں ہوتا، تو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ یہ اجر وثواب ہر اُس شخص کو دیتا ہے جس نے بھی کسی کا روزہ کھجور یا پانی کے گھونٹ یا دودھ کے ساتھ افطار کرایا، اس ماہ کا ابتدائی حصہ رحمت ہے اور درمیانی حصہ بخشش اور آخری حصہ جہنم سے آزادی کا باعث ہے، جس کسی نے بھی اپنی لونڈی اور غلام سے تخفیف کی اللہ تعالیٰ اُسے بخش دیتا ہے اور اسے جہنم سے آزاد کردیتا ہے، اس ماہِ مبارک میں چار کام زیادہ سے زیادہ کیا کرو: دو خصلتوں کے ساتھ تو تم اپنے پروردگار کو راضی کروگے اور دو خصلتیں ایسی ہیں جن سے تم بے پرواہ نہیں ہوسکتے، جن دو خصلتوں سے تم اپنے پروردگار کو راضی کرسکتے ہو وہ یہ ہیں: اِس بات کی گواہی دینا کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبودِ برحق نہیں اور اس سے بخشش طلب کرنا اور جن دو خصلتوں کے بغیر تمہیں کوئی چارہ نہیں: جنت کا سوال کرنا اور جہنم سے پناہ مانگنا، جس نے بھی اس ماہِ مبارک میں کسی روزے دار کو پیٹ بھر کر کھلایا اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اُسے میرے حوض کا پانی پلائے گا، وہ جنت میں داخل ہونے تک پیاس محسوس نہیں کرے گا۔'' **أيها الناس قد أظلكم شهر عظيم، شهر مبارك، شهر فيه ليلة خير من ألف شهر، جعل الله صيامه فريضة وقيام ليله تطوعا، من تقرب فيه بخصلة من الخير، كان كمن أدى فريضة فيما سواه، ومن أدىٰ فيه فريضة كان كمن أدىٰ سبعين فريضة فيما سواه......الخ''**[1]۔

(۱) صحیح ابنِ خزیمہ، حدیث: ۱۸۸۷۔

حکم: یہ حدیث ضعیف درجہ کی ہے۔(۱)

وجہ: ☆اِس روایت میں ''علی بن زید جدعان'' راوی کے متعلق محدثین کے اقوال کافی حد تک مختلف ہیں، اکثر محدثین نے ان پر ضعف کا حکم لگایا ہے جیسے امام احمدؒ، ابنِ معینؒ، امام نسائیؒ، ابنِ خزیمہؒ اور جوزانیؒ وغیرہ۔ ابنِ سعدؒ کا کہنا ہے کہ: "**فيه ضعيف ولايحتج به**" یہ ضعیف ہے اسے حجت نہیں بنایا جاسکتا۔ (سیر اعلان النبلاء: ۵/ ۲۰۷) اور بعض محدثین نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے۔

☆ابنِ خزیمہؒ نے صحیح ابنِ خزیمہ میں روایت کرنے کے بعد یہ کہا کہ: "**إن صح الخبر**" کہ اگر یہ خبر صحیح ہو، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کو بالجزم بیان نہیں کیا؛ مگر بعد میں بعض کتابوں میں "**إن صح الخبر**" کی جگہ صرف "**صح الخبر**" ہوگیا۔(۲)

☆جبکہ ابوحاتم رازیؒ نے "**منکر**" کا حکم لگایا ہے اور علامہ عینیؒ نے بھی ''عمدۃ القاری'' میں یہی حکم لگایا ہے۔(۳)

☆تقریباً محدثین نے حضرت سعید ابن المسیّبؒ بروایت سلمان فارسیؓ اور بروایت ابو ہریرہؓ نقل کیا ہے، جب کہ سعید المسیّبؒ کی سلمان فارسیؓ سے ملاقات ثابت نہیں ہے، اس لحاظ سے یہ روایت منقطع ہوتی ہے۔

☆اس کی سب متابعات بھی ضعیف ہیں جس پر محدثین نے ضعف یا منکر کا حکم لگایا ہے؛ کیونکہ حدیث کی دوسری سند میں جو بھی راوی ہیں ضعیف یا شدید ضعیف ہیں اور بعض راوی مجہول ہیں جیسے ''یوسف بن زیاد'' محدثین کے نزدیک شدید ضعیف ہیں، محدثین کے سخت ترین کلمات میں سے ''منکر'' کا لفظ ہے، جو ابنِ ابی حاتم رازی اور البانی رحمہما اللہ نے اِس روایت کے متعلق کہا ہے، ان حضرات کے علاوہ محدثین نے اس روایت کے متعلق ضعف کا قول تو کہا ہے؛ لیکن اس روایت کو من گھڑت اور موضوع کسی نے بھی قرار نہیں دیا ہے۔

---

(۱) امام نسائی اور حافظ ابنِ حجر رحمہما اللہ نے اسے ''ضعیف'' کہا ہے، امام احمدؒ نے اسے "**ليس بشيء**"، امام ابوزرعہؒ نے اسے "ليس بقوي" کہا ہے۔ (العلل لابن ابی حاتم: ۱/ ۲۵۱، الکامل لابنِ عدی: ۶/ ۳۳۳، تقریب التہذیب: ۲/ ۴۳، الجرح والتعدیل: ۶/ ۲۴۹) امام ابوحاتم رحمہ اللہ نے کہا: ''یہ حدیث منکر ہے''۔ (العلل لابن ابی حاتم: ۱/ ۲۴۹) علامہ عینیؒ نے اس پر ''منکر'' کا حکم لگایا ہے۔ (عمدۃ القاری: ۹/ ۲۰) شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''منکر'' کہا ہے۔ (سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ: ۸۷۱) شیخ ابواسحاق الحوینی مصری حفظہ اللہ نے کہا: ''یہ حدیث باطل ہے''۔ (النافلۃ فی الاحادیث الضعیفۃ والباطلۃ: ۱/ ۲۹۱)۔

(۲) صحیح ابنِ خزیمہ: ۳/ ۱۹۱، حدیث نمبر: ۱۸۸۷۔

(۳) عمدۃ القاری: ۹/ ۲۰۔

☆ مذکورہ روایت کا تعلق فضائل کے باب سے ہے اور فضائل میں اس قسم کی روایت پر عمل درست ہے، ملاعلی قاریؒ مذکورہ روایت کے متعلق فرماتے ہیں کہ: ''مذکورہ روایت ضعیف ہے، فضائلِ اعمال میں بالاتفاق عمل درست ہے، مواعظ وغیرہ میں تو بیان کرنے میں حرج نہیں ہے''۔ ''أن الحديث ضعيف، وهو يعمل به في فضائل الأعمال إتفاقا، ففي المواعظ ينبغي أن يكون بالأولیٰ''۔[1]

☆ لہٰذا اختلافِ اقوال کی وجہ سے محدثین کے اُصول کے مطابق بالکل ساقط الاعتبار نہیں کہا جا سکتا، اس پر من گھڑت کا حکم لگانا اور اس کو بالکل باطل روایت قرار دینا درست نہیں ہے؛ البتہ روایت سند کے لحاظ سے ضعیف ضرور ہے۔

☆ لیکن حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب اس حدیث کو جس انداز میں ذکر کیا جاتا ہے اور حدیث میں مذکور مضامین پر جس پختگی کے ساتھ عقیدہ رکھا جاتا ہے اور جس وثوق کے ساتھ اس سے مستنبط مضامین ومسائل کو بیان کیا جاتا ہے قابلِ احتراز عمل ہے، ضعیف حدیث کو اسی درجہ پر رکھ کر بیان کیا جائے گا؛ مگر فی زمانناعوام وخواص کے نزدیک یہ حدیث متواتر درجہ حاصل کر چکی ہے، جو اُصولِ محدثین کے بالکل خلاف ہے۔

تراویح کی ہر رات کا ثواب

حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہٗ سے روایت ہے، کسی شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نمازِ تراویح کی فضیلت پوچھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بندہ رمضان شریف کی پہلی رات گناہوں سے ایسا پاک صاف ہوجاتا ہے جیسے اس کی ماں نے اُسے ابھی جنا ہو، دوسری رات اُس کے بشرطیکہ وہ دونوں مؤمن ہوں گناہ بخشے جاتے ہیں، تیسری رات ایک فرشتہ عرش کے نیچے سے پکارتا ہے اے بندے! تُو نے اپنے عمل کو خالص کیا، اللہ تعالیٰ نے تیرے اگلے گناہوں کو بخش دیا، چوتھی رات اُس کو تورات، زبور، انجیل اور قرآن مجید کی تلاوت کے بقدر ثواب ملتا ہے، پانچویں رات جس نے نماز پڑھی اسے مسجد حرام یعنی مکہ مکرمہ اور مسجد مدینہ منورہ اور مسجد اقصیٰ یعنی بیت المقدس میں نماز پڑھنے کا ثواب ملتا ہے، چھٹی رات اُس کو اللہ تعالیٰ اُس شخص کا ثواب دیتے ہیں جس نے بیت المعمور کا طواف کیا اور اس کے لیے تمام پتھر اور ڈھیلے استغفار کرتے ہیں، ساتویں رات کا ثواب اس قدر ملتا ہے گویا اس نے موسیٰ علیہ السلام کو پایا ان کی فرعون اور ہامان، آٹھویں رات وہ اس قدر ثواب پاتا ہے جس قدر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ثواب دیا، نویں رات گویا اللہ اور حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم

(۱) مرقاۃ المفاتیح۔

کی عبادت کی مثل، دسویں رات کو اللہ تعالیٰ اُسے دنیا اور آخرتکی بہتری دیتے ہیں، گیارہویں رات اگر دنیا سے چلا گیا تو گناہوں سے ایسا پاک وصاف جائے گا جیسا کہ ماں کے پیٹ سے ابھی پیدا ہوا تھا، بارہویں رات کی فضیلت یہ ہے کہ اس کا چہرہ قیامت کے دن چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتا ہوگا، تیرہویں رات کی فضیلت یہ ہے کہ وہ قیامت کے دن تمام بُرائیوں سے محفوظ آئے گا، چودھویں رات کی فضیلت یہ ہے کہ قیامت کے دن رشتے دار آئیں گے اور گواہی دیں گے کہ تحقیق اس نے نمازِ تراویح پڑھی تھی، پس اس سے قیامت کے دن حساب نہیں لیا جائے گا، پندرھویں رات اللہ تعالیٰ اس کے لیے دوزخ سے چھٹکارا اور دخولِ جنت کی خوش خبری لکھ دیتا ہے، سترھویں رات اللہ تعالیٰ اُس کو نبیوں کی عبادت کا ثواب دیتے ہیں، اٹھارہویں رات ایک فرشتہ آواز دیتا ہے، اے اللہ کے بندے! تحقیق اللہ تجھ سے اور تیرے والدین سے راضی ہوا، انیسویں رات اللہ اس کے درجوں کو فردوس میں بلند کرتا ہے، بیسویں رات اس کو اللہ تعالیٰ شہداء اور صالحین کا ثواب دیتا ہے، اکیسویں رات اس کے لیے اللہ تعالیٰ جنت میں ایک نور کا گھر بناتا ہے، بائیسویں رات وہ قیامت کے دن تمام غم اور پریشانی سے محفوظ آئے گا، تیئیسویں رات اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں ایک شہر بناتا ہے، چوبیسویں رات اُس کی چوبیس دعائیں قبول ہوتی ہیں، پچیسویں رات اللہ تعالیٰ اُس سے عذابِ قبر اُٹھا دیتا ہے، چھبیسویں رات وہ پل صراط سے مثل بجلی کے گزرے گا، اٹھائیسویں رات اللہ تعالیٰ بہشت میں اس کا ایک درجہ بلند کرتا ہے، انتیسویں رات اس کو اللہ تعالیٰ ہزار مقبول حج کا ثواب دیتا ہے، تیسویں رات کا ثواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اُس سے فرمائیں گے: اے بندے میرے! جنت کے میوے کھا جو تیرا جی چاہے اور غسل کر پانی سلسبیل سے اور پی آبِ کوثر، میں تیرا رب ہوں اور تو میرا بندہ۔" **وفي الليلة الثالثة والعشرين بنى الله له مدينة في الجنة، وفي الليلة الرابعة والعشرين كان له أربعة وعشرون دعوة مستجابة، وفي الليلة الخامسة والعشرين يرفع الله تعالىٰ عنه عذاب القبر، وفي الليلة السادسة والعشرين يرفع الله له ثوابه أربعين عاما، وفي الليلة السابعة والعشرين جاز يوم القيامة على الصراط كالبرق الخاطف، وفي الليلة الثامنة والعشرين يرفع الله له ألف درجة في الجنة، وفي الليلة التاسعة والعشرين أعطاه الله ثواب ألف حجة مقبولة، وفي الليلة الثلاثين يقول الله: ياعبدي! كل من ثمار الجنة واغتسل من مياه السلسبيل واشرب من الكوثر، أنا ربك وأنت عبدي".**

حکم: یہ روایت کسی بھی مستند یا ضعیف سند سے کہیں بھی منقول نہیں؛ البتہ ایک کتاب "درۃ الناصحین" میں

بغیر سند نقل کی گئی ہے اور احادیث سے تھوڑی سی مطابقت رکھنے والا شخص بھی اِس کے من گھڑت اور درست نہ ہونے کو سمجھ سکتا ہے کہ یہ روایت بہت سی صحیح اور موضوع روایات کو جوڑ کر بنائی گئی ہے اور ایسی روایت کو ملفق (مرکب) کہتے ہیں، روایات کی تحقیق کرنے والے ایک ادارہ سے جب اِس روایت کے بارے میں پوچھا گیا تو اُنھوں نے کہا کہ یہ حدیث کے الفاظ نہیں؛ بلکہ موضوع اور من گھڑت ہیں اور یہ روایت ملفق ہے۔"**هٰذا الحديث آثار الوضع ظاهرة واضحة لكل إنسان سواء كان عاميا أو طالب علم، هٰذا الحديث ملفق من عدة أحاديث**"[1]۔

قضائے عمری پر ایک موضوع روایت

جمعۃ الوداع کے بارے میں ایک گروہ نے تو یہ نظریہ بنالیا کہ قضاء شدہ نمازوں کو ادا کرنے کی ضرورت نہیں، محض توبہ ہی سے کام چلالیا جائے، جبکہ دوسری طرف بعض لوگوں نے اس عبادت کا حلیہ بگاڑتے ہوئے یہ حل نکالا کہ ساری زندگی کی نمازیں ادا کرنا بہت دشوار ہے؛ اِس لیے رمضان المبارک کے آخری جمعہ کو قضائے عمری کے نام سے ایک نئی نماز ایجاد کی کہ "جس کی اپنی عمر بھر میں نمازیں فوت ہوگئی ہوں اور وہ انھیں شمار نہ کرسکتا ہو تو اُسے چاہیے کہ رمضان کے آخری جمعہ میں کھڑا ہو اور چار رکعات نماز ایک تشہد کے ساتھ ادا کرے، جس کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ اور سورۃ القدر پندرہ مرتبہ پڑھے، اسی طرح سے سورۃ الکوثر بھی اور نیت کے وقت یہ کہے: میں نیت کرتا ہوں چار رکعات ان تمام نمازوں کے کفارے کے طور پر جو مجھ سے فوت ہوئی ہیں" جب نماز سے فارغ ہو تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر سو مرتبہ کسی بھی طرح کا درود بھیجے اور یہ دعا تین مرتبہ پڑھے:"**اللّٰهم يامن لاتنفعك طاعتي، ولاتضرك معصيتي، تقبل مني مالاينفعك، واغفرلي مالايضرك، يامن إذا وعد وفى، وإذا تواعد تجاوز وعفا، اغفر لعبد ظلم نفسه، وأسألك اللّٰهم إني أعوذ بك من بطر الغنٰى وجهد الفقر، إلٰهي خلقتني ولم أك شيئًا، ورزقتني ولم أك شيئًا، وارتكبت المعاصي فإني مقر لك بذنوبي، إن عفوت عني فلاينقص من ملكك شيء، وإن عذبتني فلايزيد في سلطانك شيء، إلٰهي أنت تجد من تعذبه غيري، وأنا لاأجد من يرحمني غيرك، اغفرلي مابيني وبينك، واغفرلي مابيني وبين الناس ياأرحم الراحمين، ويارجاء السائلين، ويأمان الخائفين، ارحمني برحمتك الواسعة، أنت أرحم الراحمين**

(۱) تنبیہات، سلسلہ نمبر: ۱۱۸۔

یارب العالمین، اللّٰھم اغفر للمؤمنین والمؤمنات، والمسلمین والمسلمات، وتابع بیننا وبینھم بالخیرات، رب اغفر وارحم وأنت خیر الراحمین وصلّی اللّٰہ علٰی سیّدنا محمد وعلٰی آلہ وصحبہ أجمعین"۔

مزید برآں اِس پر ایک روایت گھڑ لی گئی کہ سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: یہ چار سو سال کا کفارہ ہے، یہاں تک کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "یہ ہزار سال کا کفارہ ہے، پوچھا گیا کہ جو زائد نمازیں ہیں پھر وہ کس کے کھاتے میں جائیں گی؟ فرمایا: وہ اس کے والدین، بیوی، اولاد، عزیز واقارب اور شہر کے لوگوں کے لیے ہو جائیں گی"۔

☆ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ "موضوعاتِ کبیر" میں کہتے ہیں: یہ روایت کہ جو شخص رمضان کے آخری جمعہ میں ایک فرض نماز قضاء پڑھ لے تو ستر سال تک اس کی عمر میں جتنی نمازیں چھوٹی ہوں گی اُن سب کی ادائیگی ہو جائے گی، یہ روایت قطعی طور پر باطل ہے؛ اِس لیے کہ یہ حدیث اجماع کے خلاف ہے؛ جبکہ اجماع اس پر ہے کہ کوئی بھی عبادت سالہا سال کی چھوٹی ہوئی نمازوں کے قائم مقام نہیں ہو سکتی اور فرمایا: پھر "نہایہ" سمیت "ہدایہ" کے باقی شراح کی نقل کردہ عبارت غیر معتبر ہے؛ اِس لیے کہ وہ محدثین نہیں تھے اور نہ ہی حدیث کے مخرجین میں سے کسی کی طرف سے سند بیان کی ہے"۔ حدیث: **"من قضیٰ صلاۃ من الفرائض في آخر جمعۃ من رمضان کان ذٰلک جابرا لکلّ صلاۃ فائتۃ في عمرہ إلٰی سبعین سنۃ باطل قطعا، لأنہ مناقض للإجماع علٰی أن شیئا من العبادات لاتقوم مقامَ فائتۃ سنوات، ثم لاعبرۃ بنقل صاحب (النھایۃ) ولا بقیۃ شراح (الھدایۃ) لأنھم لیسوا من المحدّثین ولاأسندوا الحدیث إلٰی أحد من المخرّجین" انتھٰی**[1]۔

☆ اِس طرح کا موضوع عمل نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے، نہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے اور نہ ہی ائمہ کرام رحمہم اللہ سے ثابت ہے کہ انہوں نے یہ نماز پڑھی ہو یا اس کا حکم دیا ہو، یا ترغیب دی ہو، یا اس میں رغبت رکھی ہو، اگر یہ نماز ثابت ہوتی تو ضرور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اسے جانتے ہوتے تو نقل کرتے، اور بعد میں آنے والے ائمہؒ رہنمائی فرماتے؛ لیکن ان میں سے کسی سے بھی نہ قولاً ثابت ہے نہ فعلاً ثابت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو فرمایا: انسان سے کوئی نماز نیند یا بھول کی وجہ سے فوت ہو جائے، یہاں تک کہ اُس کا وقت نکل جائے، تو وہ اُس کی قضاء پڑھ لے، اس کا اس کے سوا اور کوئی کفارہ نہیں، اس میں حکم ہے کہ نماز اسی وقت ادا کریں جب جاگ جائیں یا یاد آ جائے، نہ کہ رمضان کے آخری جمعہ میں اسے ادا کریں۔ "مَنْ

(۱) الأسرار الموضوعۃ في الأخبار الموضوعۃ، حدیث:۹۵۳.

نَامَ عَنْ صَلَاةٍ أَو. نَسِيَهَا فَلْيُصَلِّهَا إِذَا ذَكَرَهَا، لَاكَفَّارَةَ لَهَا إِلَّا ذٰلِکَ"۔(۱)

☆امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی جامع میں حضرت ابوعبیدہ بن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نقل کی ہے؛ چناں چہ فرماتے ہیں: حضرت ابوعبیدہ بن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: غزوۂ خندق والے دن مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چار نمازیں پڑھنے سے روک دیا تھا، یہاں تک کہ رات کا کچھ حصہ گزر گیا، جتنا اللہ تعالیٰ نے چاہا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا، تو انہوں نے اذان دی اور پھر اقامت کہی، پس ظہر کی نماز پڑھی، پھر اقامت کہی تو عصر کی نماز پڑھی، پھر اقامت کہی تو مغرب کی نماز پڑھی، پھر اقامت کہی تو عشاء کی نماز پڑھی۔"عَنْ أَبِيْ عُبَيْدَةَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ إِنَّ الْمُشْرِكِيْنَ شَغَلُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ أَرْبَعِ صَلَوَاتٍ يَوْمَ الْخَنْدَقِ حَتّٰى ذَهَبَ مِنَ اللَّيْلِ مَاشَاءَ اللّٰهُ فَأَمَرَ بِلَالًا فَأَذَّنَ ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّى الظُّهْرَ ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّى الْعَصْرَ، ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّى الْمَغْرِبَ ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّى الْعِشَاءَ"۔(۲)

☆امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کا قول نقل کرتے ہیں: جس شخص نے ایک نماز چھوڑ دی پھر اگر چہ بیس سال بھی گزر جائیں تب بھی وہ شخص اپنی اس قضاء شدہ نماز کو ادا کرے۔"وقال إبراهيم من ترک صلاة واحدة عشرين سنة لم يعد إلا تلک الصلاة الواحدة"۔(۳)

☆امام ابنِ نجیم حنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اُصول یہ ہے کہ ہر وہ نماز جو کسی وقت میں واجب ہونے کے بعد رہ گئی ہو، اُس کی قضاء لازم ہے خواہ انسان نے وہ نماز جان بوجھ کر چھوڑی ہو یا بھول کر، یا نیند کی وجہ سے نماز رہ گئی ہو، چھوٹ جانے والی نمازیں زیادہ ہوں یا کم ہوں، بہرحال قضا لازم ہے۔"فالأصل فيه أن كل صلاة فاتت عن الوقت بعد ثبوتِ وجوبها فيه فإنه يلزم قضاؤها، سواء تركها عمدا أوسهوًا أو بسبب نومٍ، وسواء كانت الفوائت قليلة أو كثيرة"۔(۴)

☆ آن لائن دارالافتاء دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ ہے کہ: ''مذکورہ پیغام کی اشاعت صحیح نہیں ہے، روایت موضوع ہے، صحیح یہ ہے کہ جتنی نمازیں قضاء ہوئی ہیں اگر ان کی حتمی تعداد معلوم نہیں ہے تو اندازہ کرے اور جس تعداد پر دل مطمئن ہو جائے اُن سب کی قضاء کرے''۔(۴)

(۱) صحیح بخاری، باب المواقيت الصلاة، حدیث:۵۹۷، صحیح مسلم، باب المساجد وموضع الصلاة، حدیث:٦٨٤۔

(۲) جامع ترمذی:۴۳۔ (۳) صحیح بخاری:۸۴/۱۔ (۴) البحر الرائق:۱۴۱/۲۔

(۴) فتویٰ (م):47=47-1433/1۔

☆ جامعہ فاروقیہ کراچی کا ایک فتویٰ قضائے عمری کی نماز سے متعلق ہے کہ: ''واضح رہے کہ مذکورہ بالا قضائے عمری کا ثبوت قرآن وحدیث اور کتبِ معتبرہ میں نہیں، قضاء نمازوں کے بارے میں شریعت کا حکم تو یہ ہے کہ قضاء نماز پہلی فرصت میں ادا کرلی جائے، چاہے نماز کا وقت باقی ہو یا نہ ہو (سوائے اوقاتِ مکروہہ کے) اسی طرح نوافل کے بجائے قضاء پڑھ لیا کرے، اور اگر کسی کا اس حالت میں انتقال ہوجائے کہ قضاء نمازیں اُس کے ذمے باقی ہوں، تو ہر نماز کے بدلے میں صدقۂ فطر کی رقم کے برابر فدیہ ادا کیا جائے؛ البتہ سوال میں جو طریقہ مذکور ہے وہ غلط اور بدعت ہے اور لوگوں کو نماز کے ترک کرنے پر جری بنانا ہے، اِسی طرح شریعتِ مطہرہ پر بہتان اور اس میں دخل اندازی کے مترادف ہے؛ لہٰذا ایسی مہمل باتوں پر عمل اور یقین نہ کیا جائے''۔

☆ علامہ شوکانی رحمہ اللہ اِس روایت کو اپنی کتاب ''**الفوائد المجموعة فی الاحادیث الموضوعة**'' (ص ۴۴) میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: یہ روایت موضوع ہے اور اس کے موضوع ہونے میں کوئی شک نہیں ہے؛ بلکہ اس روایت کا تو ان کتابوں میں کہیں نام ونشان نہیں جن کے مصنّفین نے احادیثِ موضوعہ کو جمع کرنے کا اہتمام کیا ہے؛ لیکن ہمارے زمانے میں شہرِ صنعاء میں فقہاء کی جماعت میں یہ روایت کافی مشہور ہے اور بہت سارے لوگ اس پر عمل پیرا بھی ہیں؛ لیکن ہمیں نہیں معلوم کہ اس کا وضع کرنے والا کون ہے، اللہ ان کذابین ووضاعین کا منہ کالا کرے۔ ''**هٰذا موضوع بلاشک لم أجد في شيء من الكتب التي جمع مصنفوها فيها الأحاديث الموضوعة لكن اشتهر عند جماعة من المتفقهة بدمينة صنعاء في عصرنا هٰذا وصار كثير منهم يفعلون ذٰلک ولاأدري من وضع لهم فقبح الله الكذابين**''[1]۔

☆ علامہ عبدالحئ لکھنوی رحمہ اللہ نے اِس موضوع پر اپنے رسالہ ''**ردالإخوان مما أحدثوه في آخر جمعة رمضان**'' میں سیر حاصل بحث کی ہے، شیخ ابوغدہؒ یہاں حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ: علامہ لکھنویؒ نے اس موضوع کی تحقیق میں رسالہ مذکورہ کے بیس سے متجاوز صفحات پر بڑا ہی شاندار کلام کیا ہے، اس مقام کے مطابق خلاصۂ کلام کے طور پر اس کا کچھ حصہ ذکر کیا جارہا ہے، فرماتے ہیں کہ: ''زاد اللبیب، انیس الواعظین، ادارۃ العابدین اور مفاتیح الجنان'' (معرب) میں مرقوم ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''**من فاتته صلوات ولايدري عددها فليصل يوم الجمعة أربع ركعات نفلًا بسلام واحد ويقرأ في كل ركعة بعد الفاتحة آية الكرسي سبع مرات، وإنا أعطيناک الكوثر خمس عشرة مرة قال علي بن أبي طالب سمعت رسول الله صلّى الله عليه وسلم يقول وإن فاتته صلوات**

(۱) الفوائد المجموعة في الأحاديث الموضوعة ٥٤.

سبع مائة سنة كانت هٰذه الصلاة كفارة لها قالت الصحابة: إنما غير الإنسان، أي من هٰذه الأمة، لمافاته ومافات من الصلوات من أبيه وأمه ولفوائت أولاده" یعنی اگر کسی کی اتنی نمازیں فوت ہوجائیں کہان کی تعداد کا علم بھی نہ ہوتو ایسے شخص کو جمعہ کے دن چار رکعت نفل ایک ساتھ ادا کرنا چاہیے اور وہ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سات مرتبہ '' آیت الکرسی '' اور پندرہ مرتبہ ''سورۃ الکوثر'' پڑھے۔

☆ حضرت علی ابنِ ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: مَیں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اگر کسی کی سات سو سال کی بھی نمازیں فوت ہوگئی ہوں، تو یہ نماز اُن تمام چھوٹی ہوئی نمازوں کے لیے کفارہ ہوجائے گی، صحابہؓ نے عرض کیا کہ اس امت کی عمریں تو صرف ٧٠/سال یا ٨٠/سال کی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: یہ نماز خود اس کی، اس کی اولاد کی، اس کی والدہ کی اور اس کی اولاد وغیرہ کی فوت شدہ نمازوں کے لیے بھی کفارہ ہے؛ نیز ''**من صلّى في آخر جمعة من رمضان أربع ركعات قبل الظهر الخ**'' یہ اوران جیسی غیر ثابت احادیث کتبِ مذکورہ میں پائی جاتی ہیں جو صریح البطلان ہیں، پھر علامہ لکھنویؒ نے ان احادیث کے اباطل اوران کے ناقلین پر اعتماد کرنے والوں کی تردید کے ارادہ سے فرمایا کہ ملا علی قاریؒ نے اپنی ''الموضوعات'' میں ایک قاعدۂ کلیہ ذکر فرمایا کہ احادیثِ نبویہ، مسائلِ فقہیہ اور تفاسیرِ قرآنیہ کو کتبِ متداولہ ہی سے اخذ کرنا درست ہے؛ اِس لیے کہ دیگر کتبِ غیر محفوظہ پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا؛ کیوں کہ ہوسکتا ہے کہ وہ کتابیں زنادقہ کی وضع کی شکار ہوگئی ہوں یا ملحدین کے الحاد سے ملحق ہوگئی ہوں۔

پھر علامہ لکھنویؒ نے ان احادیث کے بطلان کی دلیل دیتے ہوئے کئی وجہیں ذکر کی ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ان مصنّفین نے ان روایات کو بے سند ذکر کیا اور نہ ہی کسی مخرج تک متصل السند بیان فرمایا اور بے سند حدیث کو قبول کرنا اہلِ عقل ودانش کی شان کے خلاف ہے؛ کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اوران ناقلین کے مابین ایسے ہر خطہ بیابان ہیں جن میں بسا اوقات سواروں کی سواریاں ہلاک ہوجایا کرتی ہیں اور منزل تک رسائی نہیں ہو پاتی؛ لہٰذا ان کے بغیر صرف ''**قال رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلم كذا كذا**'' کہنا اس وقت تک حلال نہیں جب تک کہ اس کے پاس اس روایت کی اقل درجہ میں سہی کوئی وجہِ روایت نہ موجود ہوں۔(١)

❑❖❑

(١) عمدۃ الاقاویل: ٧-٣٦، مولانا رضوان الدین صاحب معروفی، شیخ الحدیث جامعہ اشاعت العلوم اکل کوا۔

احکام ومسائل

احکام ومسائلِ صدقۂ فطر

از قلم: مفتی محمد عمران صاحب قاسمی، مدرس مدرسہ مرکز العلوم بنگلور

روزہ دار کتنا ہی اہتمام کرے روزہ کے دوران کچھ نہ کچھ کوتاہی ہو ہی جاتی ہے کھانے پینے اور روزہ توڑنے والی باتوں سے بچنا تو آسان ہوتا ہے؛ لیکن لغو کلام، فضول مصروفیات اور نامناسب گفتگو سے مکمل احتراز نہیں ہو پاتا؛ اس لیے اِس طرح کی کوتاہیوں کی تلافی کے لیے شریعت میں رمضان المبارک کے ختم پر صدقۃ الفطر کے نام سے گویا کہ روزہ کی زکاۃ الگ سے واجب قرار دی گئی ہے۔

حضرت عبداللہ ابنِ عباسؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"فرض رسول الله ﷺ زكاة الفطر طُهرةً للصائم من اللغو ولرفث وطعمة للمساكين مَن أدّاها قبل الصلاة فهي زكاة مقبولة ومن أداها بعد الصلاة فهي صدقة من الصدقات".

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقۂ فطر کو ضروری قرار دیا جو روزہ دار کے لیے لغو اور بے حیائی کی باتوں سے پاکیزگی کا ذریعہ ہے اور مسکینوں کے لیے کھانے کا انتظام ہے، جو شخص اسے عید کی نماز سے پہلے ادا کردے تو یہ مقبول زکاۃ ہوگی اور جو اسے نماز کے بعد ادا کرے تو یہ عام صدقات میں سے ایک صدقہ ہے"۔

اِس روایت سے معلوم ہوا کہ صدقۂ فطر واجب ہونے کے دو مقاصد ہیں: (۱) روزہ کی کوتاہیوں کی تلافی (۲) امت کے مسکینوں کے لیے عید کے دن رزق کا انتظام؛ تاکہ وہ بھی اس روز لوگوں کی خوشیوں میں شریک ہوسکیں؛ اسی لیے پیغمبر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے کہ: "**أُغنوهم عن السوال في هذه اليوم**" یعنی اس دن مسکینوں پر اتنا خرچ کرو کہ وہ سوال سے بے نیاز ہوجائیں؛ اس لیے صاحبِ وسعت مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ صدقۂ فطر بروقت ادا کرنے کا اہتمام کریں، جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا کہ نمازِ عید سے پہلے صدقۂ فطر ادا کرنے کا ثواب زیادہ ہے، اسی بنیاد پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ عید سے دو تین دن پہلے ہی صدقۃ الفطر ادا کردیا کرتے تھے، اور یہ مناسب بھی ہے؛ تاکہ مستحق حضرات پہلے ہی سے عید کی تیاری کرسکیں۔

صدقات کے فوائد

صدقات میں بہت سے فوائد و برکات ہیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں، فوائد سے مراد دنیوی منافع ہیں اور برکات سے مراد روحانی۔ دینی منافع ہیں:

(۱) قربِ الٰہی کا حصول: سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ صدقہ وخیرات کرنے والے کو اللہ کا قرب نصیب ہوتا ہے، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''السخي قريب من الله، قريب من الجنة، قريب من الناس، بعيد من النار'' (سخی آدمی اللہ کے قریب ہے، جنت کے قریب ہے اور لوگوں کے قریب ہے اور دوزخ سے دُور ہے)۔

(۲) دوزخ سے نجات: دوسری فضیلت اس کی یہ ہے کہ اس سے دوزخ سے نجات ملتی ہے؛ اسی لیے ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''اتقوا النار ولو بشق تمرة'' (کہ خود کو دوزخ سے بچاؤ اگرچہ کہ ایک کھجور ہی خیرات کر کے کیوں نہ ہو)۔

(۳) بے شمار اجر وثواب: ایک فضیلت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو بڑھاتے ہیں اور ایک معمولی چیز بھی عظیم بنا کر قیامت میں دی جاتی ہے، قرآنِ کریم میں ہے کہ: ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِّاْئَةُ حَبَّةٍ، وَاللّٰهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾ (ان لوگوں کی مثال جو اپنے مالوں کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں ایسی ہے جیسے ایک دانہ جو زمین میں بویا گیا تو وہ سات بالیاں اُگاتا ہے اور ہر بالی میں سو سو دانے ہوتے ہیں (اِس طرح ایک دانے سے سات سو دانے پیدا ہوتے ہیں، اِسی طرح اللہ تعالیٰ صدقے کے ایک دانے کا بدلہ سات سو تک عطا کرتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ چاہیں تو اس سے بھی زیادہ دے سکتے ہیں اور اللہ بڑے سننے والے جاننے والے ہیں)۔

بخاری شریف کی ایک حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''جو شخص اپنی پاک وحلال کمائی میں سے ایک کھجور کے برابر بھی صدقہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنے داہنے ہاتھ سے قبول کرتے ہیں اور اس کو پالتے ہیں جیسے تم میں سے کوئی اپنے گھوڑے کے بچے کو پالتا ہے، یہاں تک کہ وہ کھجور ایک پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے''۔

(۴) گناہوں کی مغفرت: صدقات کا ایک روحانی فائدہ یہ ہے کہ اس سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے ایک لمبی روایت آئی ہے، اُس میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ: "**الصدقة تطفئ الخطيئة كمايطفئ الماء النار**" (صدقہ گناہ کو بجھا دیتا ہے اس طرح جیسے پانی آگ کو بجھا دیتا ہے)۔

(۵) روحانی بیماریوں سے دل کی صفائی: ایک فضیلت یہ ہے کہ روحانی بیماریوں سے صفائی حاصل ہوتی ہے اور دل کے اندر سے دنیا کی محبت کی ناپاکی اور دیگر روحانی امراض کا تزکیہ ہوجاتا ہے۔

(۶) فرشتوں کی دعا کا استحقاق: ایک فضیلت یہ ہے کہ صدقہ دینے والا اللہ کے فرشتوں کی دعا کا مستحق ہوجاتا ہے؛ چنانچہ بخاری و مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا: "**مامن يوم يصبح العباد فيه إلاملكان ينزلان فيقول: أحدهما: اللّٰهم أعط منفقا خلَفا، ويقول الآخر اللّٰهم أعط ممسكا تلَفا**". (روزانہ صبح کے وقت دو فرشتے آسمان سے اُترتے ہیں اُن میں سے ایک فرشتہ سخاوت کرنے والے کے لیے دعا کرتا ہے کہ یا اللہ! خرچ کرنے والے کو اس کا بدلہ عطا فرما اور دوسرا فرشتہ بخیل کے لیے بددعا کرتا ہے کہ یا اللہ! بخیل کا مال تلف فرما یعنی اس کے مال میں نقصان پیدا فرما)۔

صدقات دینے کے دنیوی فوائد بھی بے شمار ہیں، چند یہ ہیں

(۱) غیبی مدد و نصرت (۲) مال کا تحفظ اور امراض سے شفاء کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مال کو چوروں اور ڈاکوؤں سے اور دیگر حوادثات سے محفوظ رکھتے ہیں اور امراض سے شفاء ملتی ہے؛ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "**حصّنوا أموالكم بالزكاة وداوُوْ مرضاكم بالصدقة**" (زکاۃ کے ذریعہ اپنے مالوں کی حفاظت کرلو اور صدقہ سے اپنے مریضوں کا علاج کرو)۔

(۳) آفات اور بلاؤں اور بری موت سے تحفظ: ایک فضیلت یہ ہے کہ صدقے سے آفات اور بلائیں ٹلتی ہیں اور حادثات اور بری موت سے حفاظت ہوتی ہے؛ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "**بادروا بالصدقة فإن الصدقة لايتخطّاها**" (صدقہ کرنے میں جلدی کرو؛ کیوں کہ صدقہ کرنے سے بلاء اور مصیبت اس سے آگے نہیں بڑھتی)۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "**إن الصدقة تطفئ غضب الرب وتدفع منه السوء**" (صدقہ اللہ رب العزت کے غضب کو ٹھنڈا کرتا ہے اور بُری موت کو دفع کرتا ہے)۔

صدقۂ فطر کس پر واجب ہے

جو شخص زندگی کی لازمی ضروریات کے علاوہ اتنی قیمت کے مال کا مالک ہو جس پر زکاۃ واجب ہو سکے اُس شخص پر عید الفطر کے دن صدقۂ فطر ادا کرنا واجب ہے، یعنی صدقۂ فطر اور زکاۃ کے وجوب میں قدرے فرق ہے، زکاۃ میں مالِ نامی ہونا لازمی ہے، صدقۂ فطر میں یہ ضروری نہیں ہے، اسی طرح زکاۃ کی ادائیگی کا وجوب سال گزرنے کے بعد ہوتا ہے، صدقۂ فطر فوراً واجب ہوتا ہے؛ البتہ دونوں میں مال قرض اور ضرورتِ اصلی سے زائد ہونا چاہیے؛ ورنہ زکاۃ اور صدقۂ فطر واجب نہ ہوگا۔

☆ مسافر مستطیع پر بھی صدقۂ فطر واجب ہے اور عید کے دن وہ مسافر جہاں موجود ہو وہیں کی قیمت لگائی جائے گی۔

☆ جو شخص بیماری کی وجہ سے رمضان کے روزے نہ رکھ سکا ہو؛ لیکن وہ عید الفطر کی صبح صادق کے وقت صاحبِ نصاب ہو تو اُس پر صدقۂ فطر لازم ہے۔

☆ کسی شخص پر حسبِ ضابطہ صدقۂ فطر واجب ہو جانے کے بعد مال کے ضائع ہو جانے سے صدقۂ فطر ساقط نہ ہوگا؛ بلکہ جب بھی گنجائش ہوگی اُس پر صدقۂ فطر کی ادائیگی لازم ہوگی۔

☆ فقیر شخص عید کے دن صبح صادق سے پہلے مال دار ہو گیا اور اس نے مال دار ہونے کی حالت میں صبح کی تو اُس پر صدقۂ فطر واجب ہے۔

☆ فقیر شخص نے عید کے دن فقیر ہونے کی حالت میں صبح صادق کی، اُس کے بعد اُسی دن صاحبِ نصاب ہو گیا تو اُس پر صدقۂ فطر واجب نہ ہوگا۔

☆ اگر کسی کے پاس کئی مکانات ہیں، ایک میں وہ رہتا ہے، بقیہ خالی پڑے ہیں یا کرائے پر دے رکھے ہوں، اور اُن کی قیمت نصاب یا اس سے زائد ہے اُن پر اس کا گذارہ نہیں تو اس پر صدقۂ فطر واجب ہے۔

☆ نابالغ بچے خود کسی نصاب کے مالک نہ ہوں تو باپ کے مال دار ہونے کی صورت میں ان کی طرف سے باپ پر صدقۂ فطر نکالنا واجب ہے اور اگر وہ بچے خود صاحبِ نصاب ہوں تو ان کے مال میں سے صدقۂ فطر نکالا جائے گا۔

☆ اگر کوئی فقیر ہونے کے ساتھ عقل کے اعتبار سے کمزور یا پاگل ہو تو باپ اس کی طرف سے صدقۂ فطر نکالے گا، اگر چہ وہ بڑی عمر کا ہو اور اگر وہ مجنون خود مال دار ہو تو اس کے مال سے صدقۂ فطر نکالا جائے گا۔

☆ بالغ اولاد کی طرف سے صدقۂ فطر ادا کرنا باپ پر ضروری نہیں ہے؛ لیکن اگر وہ بچے باپ کی پرورش میں

رہتے ہوں اور باپ ان کی طرف سے صدقۂ فطر ادا کردے تو درست ہو جائے گا۔

☆ بیوی کا صدقۂ فطر شوہر پر واجب نہیں ہے؛ لیکن اگر اس کی طرف سے ادا کردے تو ادا ہو جائے گا خواہ بیوی سے اجازت لی ہو یا نہ لی ہو۔

☆ حمل کی طرف سے صدقۂ فطر واجب نہیں ہے۔

☆ مرحومین کی طرف سے صدقۂ فطر واجب نہیں۔

☆ جس شخص کا عید الفطر کی صبح صادق سے پہلے انتقال ہو جائے اُس کی طرف سے صدقۂ فطر واجب نہیں ہوتا۔

☆ جو بچہ عید الفطر کی صبح صادق سے پہلے پیدا ہو تو اس بچہ کی طرف سے صدقۂ فطر نکالنا واجب ہے یعنی باپ کے مال دار ہونے کی صورت میں اس کی طرف سے باپ پر صدقۂ فطر نکالنا واجب ہے۔

☆ صدقۂ فطر کے واجب ہونے کا وقت عید الفطر کی صبح صادق ہے، مستحب اور افضل یہ ہے کہ نمازِ عید کے لیے جانے سے پہلے پہلے صدقۂ فطر ادا کر دیا جائے؛ لیکن اگر اس وقت ادا نہ کیا جائے تو بعد میں جب چاہے ادا کر سکتا ہے اور جب بھی ادا کرے گا وہ ادا ہی کہلائے گا، اس کو قضا نہیں کہا جائے گا۔

☆ صدقۂ فطر حسبِ ضابطہ وشرائط واجب ہو جانے کے بعد ادائیگی ہی کے ذریعے ذمہ سے ساقط ہوگا، وقت گزرنے سے ساقط نہ ہوگا۔

☆ صدقۂ فطر رمضان المبارک میں بھی دینا درست ہے؛ البتہ رمضان المبارک سے پہلے ادا کرنا مفتیٰ بہ قول کے مطابق درست نہ ہوگا۔

☆ نصف صاع گیہوں کے حساب سے ایک صدقۂ فطر کی صحیح مقدار موجودہ دَور کے وزن کے اعتبار سے ایک کلو ۶۳۵/گرام ۲۷۸/ملی گرام ہوتی ہے اور مزید احتیاط کے لیے بہتر ہے کہ ایک کلو ۷۵۰/گرام دے دیا جائے، یعنی پونے دو کلو گیہوں یا اس کی قیمت دیدی جائے، اگر کوئی اس سے زیادہ دیدے تو جائز ہے؛ البتہ واجب وہی مقدار ہے جس کا ابھی ذکر کیا گیا، یہ مقدار گیہوں کی بیان کی گئی ہے اور اگر صدقۂ فطر میں کھجور، کشمش، جَو، دینا ہو تو اس مقدارِ مذکور کا دوگنا (Double) دینا چاہیے، یعنی ساڑھے تین کلو یا ان کی قیمت بھی دی جاسکتی ہے۔

☆ صدقۂ فطر میں ان چار چیزوں کے علاوہ کوئی اور چیز مثلاً چاول وغیرہ دینا ہو تو یا تو پونے دو کلو گیہوں یا ساڑھے تین کلو جَو کی قیمت کے برابر چاول وغیرہ دینا چاہیے۔

☆ صدقۂ فطر میں بازاری بھاؤ کا اعتبار ہوتا ہے کنٹرول یا راشن کی دوکانوں کے ریٹ کا اعتبار نہیں ہے۔

❑❖❑